بابِ اوّل

حدیث نامہ بر

صبح زندگی

دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ، اور بے شمار دوسرے ممالک جواُن کے ہمنوا تھے، اتحادی طاقتیں کہلاتی تھیں جبکہ ہٹلر، مسولینی اور ہیرو ہیٹو کی مملکتیں جرمنی، اٹلی اور جاپان محوری طاقتیں گردانی جاتی تھیں۔ برطانوی ہندوستان ایک حلیف ملک کی حیثیت سے جنگی کوششوں میں برابر کا شریک تھا۔ اُدھر صد سالہ غُلامی کی زنجیر پھینکنے کے لئے ہندوستان کی سیاسی، مذہبی اور سماجی تحریکیں اپنے اپنے انداز سے برسرِ پیکار تھیں۔ برطانوی سامراج اپنی دوسری نو آبادیوں کی طرح ہندوستان میں بھی سیاسی جماعتوں کو یہی سبز باغ دکھا رہا تھا کہ مقامی آبادی اُنکی جنگی کوششوں میں جتنی زیادہ حمایت و مدد فراہم کریگی وُہ اتنی ہی جلد اُنہیں حکومتِ خود اختیاری دلوادیگی۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی نوجوان سب ہی تو انگریزی فوج میں شامل ہو کر اِس خواب کی جلد تعبیر چاہتے تھے۔

میرے والد سید حلیم شاہ (مرحوم) برما فرنٹ پر جبکہ بڑے ماموں سید نذیر حُسین شاہ (مرحوم) مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقی محاذ پر اپنا فرضِ منصبی نبھا رہے تھے۔ والدہ محترمہ دونوں جانب سے پریشان تھیں۔ ان حالات میں خاندانی ریکارڈ کے مطابق 22 دسمبر 1943 عیسوی کو راقم الحروف کی دولت تاجہ زئی ضلع بنوں میں ایک سیّد گھرانے میں ولادت ہوئی۔ اور منجھلے ماموں سید مظفر شاہ کی تجویز پر الطاف حُسین شاہ نام رکھا گیا۔ نانا جان سید زمان شاہ برسوں سے اسی گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ قریبی گاؤں خواجہ خیل میں اُنکی سُسرال تھی۔ جو اپنے طور پر ایک نامی گرامی معزز و مکرّم خانوادہ تھا۔ والد محترم کی کچھ زمین اپنے آبائی وطن تبی سر، تحصیل عیسیٰ خیل (ضلع میانوالی) اور بیت الغریب و پیر سباق (ضلع نوشہرہ) میں بھی تھی۔ لیکن نانا جان جو رشتے میں اُنکے ماموں بھی لگتے تھے، کی محبتوں بھری شخصیت اُنہیں تاجہ زئی کھینچ لائی تھی۔ اپنے والدین کے سایہء عاطفت سے تو وہ بچپن میں ہی محروم ہو چکے تھے۔ [1]

ہمارے پڑوس کی بڑی حویلی، گاؤں کے ایک بڑے ہندو زمیندار کی تھی، جسمیں اتنا ہی بڑا اُنکا غیر منقسم خاندان آباد تھا۔ گاؤں میں صرف گنتی کے چند ہندو گھرانے تھے لیکن گاؤں کے ایک معتدبہ رقبہ زمین کے وہ

[1] خاندانی پس منظر کے لیے "تذکرہ ساداتِ پیر سباک" مصنفہ ڈاکٹر چراغ حسین شاہ مُلاحظہ فرمایئے۔

مالک تھے۔ کچھ یہی حال ضلعی صدر مقام بنوں کا تھا۔ جہاں سوائے تین چار مسلم گھرانوں کے سارا شہر ہندوؤں اور سکھوں کی ملکیت تھا۔ باوجود عقائد کے اختلافات کے گاؤں کے سب باسی ایک دوسرے سے پیار محبت سے رہتے تھے۔ شاید ہر کوئی اپنے معاشی وسماجی مقام سے مطمئن تھا یا شاید مسلمان اپنی عددی اکثریت سے مطمئن تھے اور ہندو اپنی معاشی گرفت سے۔

بہرصورت ہمارے تو سب اڑوس پڑوس والے بڑی قدر کرتے تھے۔ آخر وہ سب لوگ ہمیں نیک بزرگوں کی اولاد سمجھتے تھے۔ بالکل اپنے قریبی عزیزوں کی طرح ہماری ہندو خالائیں بھی ہماری خوشیوں میں برابر کی شریک تھیں اور سب نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آنے والے مہمان کو تحائف سے لاد دیا۔ کیا خوبصورت کپڑے اور کیا انوکھے انوکھے کھلونے۔ اماں بتاتی ہیں کہ چند روز بعد گاؤں میں خسرے کی وبا پھوٹ پڑی۔ سب ہی بچے اس موذی مرض کے شکار ہو گئے۔ اور ساتھ ہی میں بھی۔ اُس دور کے علاج میں تو دم درود اور ٹوٹکوں کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ ہندو پڑوسیوں کی بزرگ ترین خاتون کا مشورہ میرے لئے یہ آیا کہ کالی دیوی کا چڑھاوا دیا جائے تو تب ہی اس موذی مرض سے نجات حاصل ہو گی۔ سب گاؤں والے تو ایسے آسان اور تیر بہدف دوا پر ضرور کان دھرتے تھے لیکن ہماری نانی جان اپنے عقیدے پر مُصِر تھیں۔ فرمانے لگیں "نواسا تو خداوند کریم اور دے دیں گے لیکن کالی دیوی سے کسی بھی قسم کی آس لگانا شِرک ہے"۔ ربِ ذوالجلال کو اُنکی ایمان کی یہ پختگی پسند آ گئی اور آئی بلا یونہی ٹل گئی۔

سرحد کا ریفرینڈم

3 جون 1947ء کو ہندوستان کے بٹوارے کا اعلان ہوا۔ اور ساتھ ہی شمال مغربی سرحدی صوبے میں ریفرینڈم کرانے کا فیصلہ ہوا۔ اس صوبے کے لوگوں نے یہ بتانا تھا کہ آیا وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ہمارے بنوں شہر میں تو وہ تاریخی جلسہ منعقد ہوا تھا جسمیں کانگریس کے حامی خُدائی خدمتگار تنظیم نے قراردادِ پختونستان منظور کی تھی، جس کے مطابق صوبہ سرحد اور ملحقہ قبائلی علاقے کو آزاد اور خودمختار قرار دے کر مستقبل کے بھارت اور پاکستان دونوں سے علیٰحدہ کرنا تھا۔ ریفرینڈم کے لئے کنویننگ میں دو مذہبی رہنماؤں کے نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان میں ایک پیر صاحب مانکی شریف تھے تو دوسرے پیر عبداللطیف زکوڑی کی قدآور شخصیت تھی۔ ہمارے بزرگوں نے بھی آزادی کے سُہانے خواب کو حقیقت کا روپ

دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ والدمحترم انگریزی فوج میں ہوتے ہوئے بھی پاکستان کے لئے ہونے والے ریفرینڈم میں بنفسِ نفیس شریک ہونے کے لئے بیتاب تھے۔ جب انگریز کمانڈنٹ نے اُنہیں اس مقصد کے لئے رُخصت دینے سے معذرت ظاہر کی تو انہوں نے فوراً جناح صاحب کو خط لکھنے کی دھمکی دی۔ بالآخر ریفرینڈم میں صوبہ سرحد کی 96 فی صد اکثریت نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالے۔ اور اگرچہ اس وقت صوبے کی حکومت کانگریسی تھی پھر بھی کانگریس کے عظیم رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر اکابرین کی اس موقع پر سرحد کے دورے میں خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی اور کئی جگہ سے تو وہ بمشکل اپنی جانیں بچا سکے۔

14 اگست 1947ء کو برطانوی عملداری کا خاتمہ ہوا۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم ہوئی۔ ایک آزاد نو آبادی کے طور پر مملکتِ پاکستان دُنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آ گئی اور صوبہ سرحد کے عوام برضا و رغبت اس نئی مملکت کے شہری قرار پائے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریس پارٹی کی حکومت توڑ دی گئی اور خان عبدالقیوم خان کی سربراہی میں سرحد میں مسلم لیگی حکومت قائم کر دی گئی۔

سانحہ پہ سانحہ

جو سب سے بُری سیاسی خبر بحثیت ایک پونے پانچ سالہ بچے کے میرے سُننے میں آئی وہ ایسی جان لیوا خبر تھی جس نے میرے سب خاندان کو اور دراصل پوری اُمتِ مسلمہ کو رُلا دیا تھا، یہ تھی کہ 11 ستمبر 1948ء کو بانیءِ پاکستان محمد علی جناحؒ اس نوزائیدہ مملکت کے سب ہی مکینوں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ گئے۔ اُدھر تقسیمِ ہندوستان کے ایجنڈے کے کئی اہم نکات ابھی تک تصفیہ طلب تھے۔ حیدر آباد دکن اور جونا گڑھ کو تو بھارت نے ہڑپ کر لیا تھا۔ کشمیر میں ہندو مہاراجہ کے بھارت سے الحاق کے اعلان سے مسلم اکثریت کی اُس سب سے بڑی ریاست میں ایک ایسی آگ کے شعلے بھڑک اُٹھے جو آج نصف صدی گزرنے کے باوجود بھی بُجھتے نظر نہیں آ رہے۔ اس انسانی المیہ میں ہزاروں لاکھوں مرد شہید، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ 1948ء میں جب پاکستانی قبائل جنگِ کشمیر میں حصہ لینے کے لئے اُس جنّت نظیر وادی کی طرف روانہ ہوئے تو والد محترم سیالکوٹ چھاؤنی میں تعینات تھے۔ سیالکوٹ جاتے ہوئے قبائلی رضا کاروں سے بھری ہوئی ٹرین میں اُنکے ہمراہ سفر کیا۔ ساری رات اُنکے رزمیہ گیت سُننے کا بھی موقع ملا۔ بچاری ٹرین کی سیٹوں اور ڈبوں کے ساتھ اُن جیالوں کا جو سلوک نظر آیا وہ کشمیر میں آئندہ پیش ہونے والے واقعات کی نشاندہی کرنے کے لئے کافی تھا۔ جموں کا علاقہ

قریب ہونے کی وجہ سے ساری رات توپوں کی گھن گرج ہی سُننے کو ملتی تھی۔ مسئلہ کشمیر تو حل طلب ہی رہا۔ بھارت کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دینے کا راگ الاپتا رہا، باوجود اقوام متحدہ کی کشمیر میں ریفرینڈم کر کے کشمیریوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے منظور ہونے والی متعدد قراردادوں کے۔ اسی کے ساتھ مشترکہ دریاؤں سے پیدا ہونے والے مسائل تھے جو سب وادیءِ کشمیر سے ہو کر پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن جو سب سے بڑی سزا بھارت سرکار نے پاکستانیوں کو اپنے سے علیٰحدہ ہونے کی دینی تھی وہ اسلحہ کی دوڑ، ہر دم بڑھتے ہوئے فوجی اخراجات اور اہلیانِ پاکستان کے لئے اِسی بہانے جمہوریت کے ثمرات سے محرومی کی سزا تھی۔ پاکستان میں برابر مارشل لاء لگتا رہا اور فوجی حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔

بانیءِ پاکستان کی وفات اور نوزائیدہ مملکت کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل کے بعد سیاسی حکومتیں یکے بعد دیگرے بدلتی رہیں۔ اور پاکستان کے عوام کو جمہوری اور غیر جمہوری دونوں قسم کے حکمرانوں کے طرزِ حکومت کا موازنہ کرنے کا کافی موقع ملتا رہا۔ اس کشمکش میں اصل پاکستان کا ایک حصہ جُدا ہو کر دسمبر 1971ء میں ایک آزاد ریاست ''بنگلہ دیش'' بن گیا۔

نمودِ سحر

پہلی جنگِ کشمیر ختم ہوئی تو والد گرامی کی پوسٹنگ شیخوپورہ ہوگئی۔ اُس وقت کی لیاقت حکومت نے ملکی دفاع میں عام شہریوں کو شامل کرنے کے لئے پاکستان نیشنل گارڈز کے نام سے نیم فوجی دستے تیار کرنے کی ٹھانی۔ شیخوپورہ میں ایک مقتدر سیاسی شخصیت محمد حُسین چٹھہ کو اس کا اعزازی کرنل اور والد گرامی کو ایڈ جوٹنٹ مقرر کیا گیا۔ ان ہی دِنوں بھارت نے اپنی فوجیں پاکستان کی سرحد پر جمع کر رکھی تھیں اور لیاقت علی خان صاحب نے اپنی ایک تقریرِ دلپذیر میں اُنہیں اپنا مُکا بلند کر کے للکارا تھا۔ سرحدوں پر تو صورتِ حال کشیدہ ہو رہی تھی لیکن سیاسی میدان میں سرکار نے ممتاز محمد خان دولتانہ کی منتخب حکومت کو توڑ کر صوبہ پنجاب میں گورنر راج نافذ کر دیا۔ سردار عبدالرّب نشتر گورنر بنے اور انتظامی امور چلانے کے لئے اُنہیں چھ مشیروں کی ایک کونسل دی گئی۔ ہمارے پڑوسی مَلک محمد انور صاحب مشیر بنے اور چند روز تک اڑوس پڑوس میں خوب دعوتیں اور تقریبات منعقد ہوتی رہیں۔ ملک محمد انور بعد میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ کے کنوینر مقرر ہوئے۔ ہمارے گھروں کے سامنے سے گزرنے والی سڑک اُن کے نام سے منسوب ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والے فسادات میں متحدہ صوبہ پنجاب سب

سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہ صوبہ تقسیم ہوا۔ لاہور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ٹھہرا۔ سکھوں کے بیشتر تاریخی اور مذہبی مقامات مغربی پنجاب میں رہ گئے، اور بیشتر سکھ آبادی مشرقی پنجاب چلی گئی۔ تبادلہ آبادی کا یہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ لاکھوں مسلمان مرد عورتیں اور بچے پاکستان منتقل ہوئے۔ لُٹے پٹے قافلے اپنی اپنی داستانِ غم لیکر ایک مملکت سے دوسری میں منتقل ہوئے۔ ہمارے گھر اور سامنے ریلوے کی پٹری کے درمیان سینکڑوں، ہزاروں خیمے آناً فاناً قائم ہو گئے۔ حکومت نے مہاجرین کی امداد کے لئے خصوصی فنڈ قائم کیا۔ سب نے بشمول طلباء کے بڑھ چڑھ کر اس فنڈ میں اپنا حصہ ڈالا۔ خدمت اور نُصرت کا ایک عظیم جذبہ تھا جو ہر سُو نظر آ رہا تھا۔

قلعہ شیخوپورہ

شیخوپورہ ہی میں میری تعلیمی زندگی کا آغاز ہوا۔ پہلے تو والدین کی خواہش کے مطابق ملک انور صاحب کے میرے ہم عمر بچے مجھے اپنے پرائمری سکول میں اپنے ساتھ لے گئے۔ پر مجھے اَساتذہِ کرام کا معصوم بچوں کے ساتھ سخت رویہ کے ساتھ پیش آنا قطعاً نہ بھایا۔ پھر میرے پھوپھی زاد بھائی محمد جنید شاہ مجھے اپنے مڈل سکول میں لے گئے۔ وہاں تو معاملہ اور ہی دلسوز تھا۔ اور جب پہلے ہی پیریڈ میں ایک اُستادِ محترم نے اپنے ایک شاگرد کو ڈنڈے کے زور پر سبق سکھانا شروع کیا۔ اور دوسرے کو مُرغا بننے کو کہا تو مجھ سے یہ جورِ اُستاد ہرگز برداشت نہ ہو سکا۔ احتجاجاً میں نے اپنی ننھی منھی چیخوں سے سارے سکول کو سر پر اُٹھا لیا۔ اسکے بعد تو میں اعلانیہ باغی ہو گیا اور اپنے والدین کو صاف بتا دیا کہ سکول ہرگز نہیں جاؤں گا۔ روز ملک صاحب کے بچے علی الصباح مجھے تلاش کرتے تھے اور میں اپنے بنگلے کے گیٹ کے سامنے والی چھوٹی سی پُلی کے نیچے روپوش ہو جاتا تھا۔ آخر والدہ محترمہ نے کسی ہمدرد کے مشورے پر مجھے ایک گرلز سکول کے پرائمری سیکشن میں اُستانیوں کے حوالے کر دیا۔ اتفاقاً یہ خواتین کچھ زیادہ ہی مہربان ثابت ہوئیں لیکن یہاں مسئلہ ہی کچھ اور تھا۔ عام اسباق کے علاوہ سینے پرونے اور خانہ داری کی کلاسز بھی تھیں۔ یہ تو میں کرنے سے رہا۔ لیکن بمقابلہ دوسرے لڑکوں کے جو میرے ہَم جماعت تھے، مجھ سے سب اساتذہ نہایت ہی خوش تھیں کیونکہ میری شرارتیں قطعاً تکلیف دِہ نہیں ہوتی تھیں اور اُنکی خواہش تھی کہ میں اُنکا سکول نہ چھوڑوں لہذا میرے ساتھ ان مخصوص زنانہ مضامین کے بارے میں کافی فراخدلانہ برتاؤ کیا گیا۔ لیکن میرے پڑوسی بچے مجھے ''کُڑیوں دے سکول'' میں پڑھنے کا طعنہ ضرور دینے لگے۔ سِکھوں کا عظیم گُورو بابا نانک شیخوپورہ کے ہی ایک گاؤں تلونڈی (ننکانہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک روز والد صاحب اور اُنکی ٹیم کے ہمراہ ننکانہ جانے کا

بھی اتفاق ہوا۔ گُوروجی کی جنم بھومی کی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے سب کو پانی سے ہاتھ پاؤں صاف کرنے کو کہا گیا، اور سر پر کچھ پہننے کو۔ میرے لئے خصوصی اجازت حاصل کی گئی کہ میرے سر پر کچھ نہ تھا۔ والد صاحب نے سکھ بزُرگوں سے اُنکی خیریت معلوم کی تو اُنہوں نے بتایا کہ باقی تو سب ٹھیک ہے لیکن اُنکی خواہش ہے کہ جنم بھومی کی عمارت امرتسر منتقل کر دیں۔ والد صاحب نے کہا کہ ''یہ تو آسان کام ہے۔ یہاں سے سارا ملبہ ڈھا کر وہاں منتقِل کر دیں''۔ لیکن وہ حضرات فرمانے لگے نہیں اصل مسئلہ تو اس زمین کا ہے جو اس عمارت کے نیچے ہے۔ بہر حال جب فوجیوں کو بارڈر پر موروچوں میں جانے کے احکامات موصول ہوئے تو ہم بچے والدہ کے ہمراہ گاؤں منتقل ہو گئے، اور آئندہ چند ماہ تک گاؤں کے پرائمری سکول میں پڑھنا نصیب ہوا۔

دیہاتی زندگی

گاؤں میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کی فہرست ہی جُدا تھی۔ خُدا کے بندوں سے پُر خلوص تعلق کے علاوہ یہاں گھریلو چوپایوں کی رکھوالی اور نگہداشت کا انعام تازہ دودھ، دہی، مکھن اور لسّی ملنے لگا۔ فصل کی کٹائی کے دنوں میں گاؤں والوں کا دل خوش کُن اتحاد اور خوشیوں کا اجتماعی اظہار، عمر کو بڑھانے کا سبب بننے لگا۔ ساتھ ہی جنگلی خرگوشوں کا شِکار اور بمطابقِ موسم بٹیروں، مرغابیوں اور کونجوں کی آمد پر اُنکی سواگت کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ سکول کے ٹاٹ پر بیٹھ کر کبھی سلیٹ پر چاک کا استعمال اور کبھی سرکنڈوں کے قلم سے لکڑی کی تختی پر خوشخطی کی مشق اور چُھٹی ہونے سے قبل آخری پیریڈ میں سب سکول کے بچوں کا مِل کر حسابی پہاڑوں کا با آوازِ بُلند وِرد، ایک یادگار اور دِلنشیں منظر ہوتا تھا۔ سالانہ امتحان کے لئے ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز اور ان کا عملہ آتا تھا اور امتحان واقعی پوری طرح شفاف اور کھرے اور کھوٹے کی پہچان آسان بنا دیتے تھے۔ یہاں زندگی فطرت کے قریب نظر آئی۔ نانا جان کے ساتھ گاؤں کی مسجد میں جانا اور چوپال میں گاؤں والوں کے ساتھ بیٹھ کر سب کے دُکھ درد میں شریک ہونے کا موقعہ ملنے لگا۔ یہیں کی مسجد میں زندگی کی پہلی نماز پڑھی اور پھر بفضلِ خدائے بزرگ و برتر کبھی نماز پنجگانہ نہیں چھوڑی۔ اپنی نانی اماں سے قُرآنی قاعدہ گاؤں کے دوسرے بچوں کے ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کیا۔ اس سے قُرآن کا ناظرہ پڑھنے کا سلیقہ ملا۔ آج بھی جب کبھی سفر یا بیماری کی وجہ سے کسی دن تِلاوت کی سعادت نصیب نہیں ہوتی تو سارا دِن بے قرار گزرتا ہے۔ خدائے عز و جل دونوں بزرگوں کے درجات بلند فرمائے۔

پہلے قومی انتخابات

اُن ہی دنوں صوبہ سرحد میں اور سارے ملک میں آزادی کے بعد پہلے انتخابات منعقد ہوئے۔ ہماری اب تک کی قومی اور صوبائی اسمبلیاں آزادی سے قبل 1946ء میں ہونے والے عام انتخابات کے تحت قائم ودائم تھیں۔فرق یہ پڑا تھا کہ صوبہ سرحد کی کانگریسی حکومت ریفرینڈم کے بعد توڑ دی گئی تھی اور حکومت مسلم لیگی زعماء چلا رہے تھے۔کانگریس اور اس کی متعلقہ عبدالغفار خان صاحب کی سُرخ پوش خُدائی خدمت گاروں کی تنظیم کی کمر تو بابڑا فائرنگ جیسے واقعات کے بعد مکمل طور پر ٹوٹ چکی تھی، اور اب خان عبدالقیوم خان وزیراعلیٰ سرحد صوبہ کے بلا شرکتِ غیرے حکمران تھے۔اُن کی مفادِ عامہ میں اصلاحات قابلِ صد ستائش ضرور تھیں لیکن اُنکے سیاسی طور طریقے جمہوری روایات سے بمشکل میل کھاتے نظر آتے تھے۔کچھ ایسی ہی صورت باقی صوبوں میں تھی۔خود ہمارے حلقے میں 1952 کے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے لئے دو امیدوار مقابلے میں تھے۔ایک طرف مسلم لیگ کے بیرسٹر سیف اللہ خان تھے اور دوسری جانب آزاد اُمیدوار محمد اکبر خان صاحب تھے۔خان قیوم کی نصرت و حمایت آزاد اُمیدوار کے ساتھ تھی اور وہی کامیاب رہے۔کیونکہ انتخابات کی صورت حال یہ تھی کہ سکول کے سب ہی بچوں نے اپنے غیر حاضر بڑوں کی طرف سے ووٹ ڈالے۔ ہر بچہ فخریہ زیادہ سے زیادہ ووٹ ڈالنے پر مُصر تھا۔راقم الحروف نے بھی ملک کے پہلے انتخابات میں اپنا یہ غیر جمہوری حق اپنے والد صاحب کے نام سے استعمال کیا۔نانا جان اور راقم الحروف کے ووٹ مخالف سمتوں میں کاسٹ ہوئے۔کیونکہ دوسری جماعت کے ایک طالب علم سے توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے۔بالکل ایسی ہی صورتِ حال صوبے کے دیگر حلقہ ہائے انتخاب میں رہی۔یہ تھی وہ خِشتِ اول جو جمہوریت کی تربیت میں مستقبل کے رائے دہندگان کے اذہان میں رکھی گئی۔

پشاور چھاؤنی

والد صاحب کی پوسٹنگ پشاور ہوئی تو ہم بھی پشاور کنٹونمنٹ کے رہائشی بن گئے۔مال روڈ پر ایک خوبصورت محل وقوع کے ساتھ ساتھ بہت ہی اچھے پڑوسی بھی نصیب ہوئے۔چھوٹے بھائی چراغ اور مجھ دونوں کو کینٹ پبلک سکول میں داخلہ مل گیا۔ساتھ ہی گاؤں کے ٹاٹ سکول اور ایک جدید تدریسی ماحول کا فرق بھی معلوم ہونے لگا۔نہ صرف ملیشیا کی شلوار قمیض والی یونیفارم نے شرٹ، نیکر اور ٹائی کا روپ دھار لیا بلکہ ساتھ ہی

گو یا تعلیم اور تعلّم کا سارا فلسفہ ہی بدل گیا۔ اُستاد گلاب شاہ کی سخت گیر تعلیمی پالیسی قصہء پارینہ بن گیا۔ سارا دن حسابی پہاڑوں کی گردان کرنے کی بجائے اب ہماری انگلستان سے درآمد کردہ میڈم نرسری رائمز یاد کرنے پر زور دیتی تھیں۔ گلاب شاہ صاحب کو جب زیادہ غصہ آتا تھا تو اُنکے اپنے لڑکے عبدالستار کی شامت آجاتی تھی جنہیں وہ نہایت بے دردی سے مشقِ ستم بنایا کرتے تھے۔ یہاں تو میڈم جس بچے سے خوش ہو جاتیں اُسے کوئی نہ کوئی گِفٹ ضرور عنایت فرماتیں اور ساتھ ہی ہم سب کا جذبہء رقابت بڑھانے کے لئے اُس نادر تحفے کو ساختہ انگلستان بتلاتیں۔ اس سکول میں کسی بھی تقریب میں مہمانِ خصوصی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نہیں ہوتے تھے، بلکہ صوبے کے وزیرِاعلیٰ یا گورنر ہوا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقعے پر ہمیں گورنر خواجہ شہاب الدین سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل ہوا۔ وزیرِاعلیٰ صاحب بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ یہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ جب ہم نے سُنا کہ خواجہ صاحب اکثر تنہائی میں گُن گُنایا کرتے تھے کہ ’’تعریف اُس قیوم کی جو یار ہے ہمارا‘‘۔

برادرم محمد جنید اور چھوٹے ماموں امام شاہ بھی ہمارے ہی ہاں رہائش پذیر تھے۔ جنید بھائی تو سکول کے طالب علم تھے لیکن اُنکا شوق اُس وقت پاکستان کی رائل ائرفورس کی رائل زندگی سے لُطف اندوز ہونا تھا۔ فضاؤں میں تو وہ نہ اُڑ سکے لیکن بالآخر پاک فوج سے بطور آنریری کیپٹن ریٹائر ہوئے اور ساتھ ہی 1971 کی پاک بھارت جنگ کے شاخسانے میں جنگی قیدی بھی رہے۔ ماموں صاحب اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے۔ اُس عظیم درسگاہ میں اُنکی شب و روز کی کارگزاریاں اور پھر اُنکی زبانی کسی الف لیلوی داستان کی اوراق گردانی سے کم دلچسپ نہ تھیں۔ وہ یار باش انسان تھے اور اُنکے دوست ملنے آتے تھے تو قصہء چہار درویش مکمل ہو جاتا تھا۔ ان دوستوں میں قاسم خان خواجہ خیل، اُنکے کزن محمد اسلم خان (بعد میں گروپ کیپٹن، پاکستان کے برطانیہ میں ملٹری اتاشی اور پاکستان ٹوبیکو کمپنی کے سینئر ایگزیکٹیو بھی رہے) سردار علی خان صاحب (ڈاکٹر سردار علی جو بعد میں صوبے کے سیکرٹری ہیلتھ، گومل یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور پبلک سروس کمیشن کے ممبر رہے) اور خواجہ محمد خان (جو نامی گرامی ایڈووکیٹ تھے)۔ ساتھ ہی ہمارے والد صاحب کے کزن سید منوّر شاہ (جو پاک آرمی میں بحثیت میجر 1971 کی جنگ میں اسیر ہوئے۔ الیکٹرونک انجینئرنگ کی تربیت برطانیہ اور چین سے حاصل کی) وہ اُن دنوں کالج یونین کے الیکشن لڑ رہے تھے اور اُنکی کامیابی کے جشن میں شامل ہونے کے لئے ہم بھی اسلامیہ کالج دیکھنے گئے اور اُسکی لازوال تاریخی عمارت کی خوبصورتی اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر

رہ نہ سکے۔ ماموں صاحب کے ایک اور دوست اُتمانزئی (چارسدہ) کے محمد عثمان تھے جنکی شخصیت بڑی جاذب نظر اور متاثر کُن تھی۔ بعد میں وہ ایک مشہور بینکر بنے۔ وہ اسلامیہ کالج کی خیبر یونین کے صدر رہ چکے تھے اور سرحد کے ایک مشہور سیاسی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔

اُسی 48 دی مال پر ہمیں والد گرامی کے جن شناساؤں اور دوستوں کی زیارت اور اُنکی صحبت سے فیضیاب ہونے کا بھرپور موقع ملا۔ اُنمیں نمایاں سرور جان خان (جو صوبے کی پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے چیف انجینئر اور ایک وقت مغربی پاکستان کے فلڈ کنٹرول کے انچارج جائنٹ سیکرٹری رہے) اُنکے کرم گڑھی سکیم کی تکمیل اور اُس سے صدیوں سے پیاسی زمینوں کی آبپاشی میں نمایاں رول کو مروت قبیلہ ہمیشہ یاد رکھے گا۔ پھر سپرینٹنڈنٹ ریلوے پولیس عبدالقادر خانصاحب جو ہر ضرورت مند کی آواز پر لبیک کہنے میں سکون محسوس کرتے تھے۔ مشہور ماہر تعلیم عبدالہاشم خان جو اُن دنوں پشاور یونیورسٹی کے ڈپٹی رجسٹرار تھے اور بعد میں رجسٹرار، وائس چانسلر، وزیر تعلیم اور جانے کیا کچھ رہے، پیر معصوم شاہ صاحب سرحد کے نامی گرامی قانون دان تو اُنکے بچپن کے دوست تھے۔ ان ہی شخصیات میں سرور جان صاحب کے داماد غلام اسحاق خانصاحب تھے جو اُس وقت صوبائی حکومت میں ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے، لیکن اپنی خداداد قابلیت، ذہانت اور فرض شناسی کی بدولت بعد میں ملک میں ایک سے ایک ذمہ دارانہ عُہدے پر متمکن ہوئے۔ وہ واپڈا کے چیئرمین، سٹیٹ بینک کے گورنر، سیکرٹری جنرل مالیات، وزیرِ مالیات، چیئرمین سینٹ اور آخرکار صدرِ پاکستان بنے۔ یہاں ایک اور عظیم شخصیت کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے اور وہ تھے پشتو زبان کے ملک الشعراء سمندر خان سمندؔر جن کی زیارت سے ہم اکثر فیضیاب ہوتے تھے۔ جب وہ ہماری رِہائش گاہ کے سامنے مال روڈ کے فُٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے گزرتے تھے اور ساتھ ہی ہم کھیلتے کودتے شاہینوں پر ایک محبت بھری نظر ڈالتے ہوئے ہمارا سَلام قبول فرمالیتے تھے۔ اُنکا ترانہ ''زہ یم د روند پختون'' اُن دنوں اکثر ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتا تھا اور حق یہ ہے کہ سمندر خان صاحب بنفسِ نفیس ایسے ہی اولوالعزم انسان کی تصویر تھے۔

1954 میں پاکستان کی سیاسی تاریخ نے ایک اور پلٹا کھایا۔ گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت توڑ کر امریکہ سے اپنے سفیر محمد علی بوگرہ کو واپس بُلا کر اُنہیں پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ سونپ دی۔ ساتھ ہی خان قیوم کی وزارتِ اعلیٰ اُس وقت کے صوبے کے انسپکٹر جنرل پولیس عبدالرشید خان کے حوالے

کر دی اور صوبے کے مردِ آہن خان عبدالقیوم خان کو مرکز میں خوراک وزراعت کی وزارت سونپ دی۔شنید یہ تھی کہ خان قیوم کے ممکنہ جانشین کے لئے غلام اسحاق خان صاحب سے بھی بات ہوئی لیکن خان صاحب نے یہ شرط لگائی کہ وزارتِ اعلیٰ کی گدی چھین جانے کی صورت میں اُنہیں دوبارہ اپنے سابقہ عُہدے پر بحال کر دیا جائے۔ بہرحال یہ گارنٹی کوئی نہ دے سکا اور اُنہوں نے صبر کا پھل واقعی بہت میٹھا پایا۔

لکی مروت

والد گرامی فوجی خدمات سے ریٹائر ہوئے تو اپنے ضلع بنوں میں ریٹائرڈ فوجیوں کی نگہداشت کی ذمہ داری سنبھال لی،اور مجھے اُس وقت کے تحصیل ہیڈ کوارٹر لکی مروت کے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرادیا گیا۔یہاں میں صرف چند ماہ ہی رہا لیکن یہاں کے قیام نے اس علاقے کے باسیوں کی بودوباش،رسم و رواج ،تاریخ ،ثقافت ،روایات،سیاست اور معیشت کے متعلق میری معلومات میں بے انتہا اضافہ کیا۔جو آج تک میرے لئے سرمایۂ حیات ہے۔

لکی کے گردونواح کے ریتیلے دیہات میں جاکر بچشم خود لوگوں کی معاشی مشکلات ،طرز زندگی ''تور اور سپین گُند'' (سیاہ وسفید دھڑے) کے خوانین کی باہمی رقابتوں اور عوام الناس کے ذہن میں اُنکا مشکل کُشا کا رول،سب کچھ کے متعلق آگاہی ہوئی۔تعلیم اور ذرائع مواصلات کی ترقی کے ساتھ ساتھ حالات کافی حد تک بدلنے لگے ہیں ۔لیکن سماجی وتہذیبی روایات بدلتے بدلتے وقت لگتا ہے۔اس اثناء میں کئی نسلیں گذر جاتی ہیں۔اور یہی کچھ یہاں بھی ہو رہا ہے۔آج یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوتی ہے کہ اب اکثر دیہات میں بجلی کی نعمت میسر آ گئی ہے۔واٹر سپلائی کی سکیمیں بھی کام کر رہی ہیں اور سڑکوں کا ایک جال پھیل گیا ہے جبکہ ان سب علاقوں میں راقم الحروف اُس وقت پاپیادہ اور یا پھر اونٹ یا گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے مہربان ماموں کے ہمراہ جو محکمہ مال کے ایک سرگرم اہلکار تھے،قریہ بہ قریہ گھومتا رہا ہے۔ پینے کے پانی کی دستیابی گویا جوئے شیر لانا تھا۔ایک جگہ تو واقعی کسی فرہاد نے یہ کوشش بھی کی تھی کہ پہاڑ کی دوسری جانب سے پانی لایا جائے لیکن شاید وَسائل یا تکنیکی مہارت کی کمی کی وجہ سے اُس نامعلوم مجاہد کا یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا تھا۔ بہرصورت منصوبہ کی باقیات یہ بتانے کے لئے کافی تھیں کہ

زندگانی کی حقیقت کوہ کُن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

یہاں میں اپنے دو عزیزوں کی میزبانی کا ذکر ضرور کروں گا جن کے ہاں یہ چند مہینے میں نے گذارے۔

ایک تو لکی مروت کے مضافات مچن خیل کے ہردلعزیز بزرگ پیر صاحب جنان شاہ مرحوم تھے جن کا دستر خوان ہر خاص و عام کے لئے بچھا رہتا تھا۔اُن کی بنائی ہوئی خوبصورت مسجد کی شاندار نقش نگاری نگاہوں کے لئے آسودگی کا سبب بنتی تھی۔قدرت نے بھی اُنکی رہائشگاہ کوایک صدیوں پُرانے برگد کا درخت تحفتاً دیا تھا جس کے سائے تلے سوڈیڑھ سو چارپائیاں آسانی سے رکھی جاسکتی تھیں۔یہ تحصیل ہیڈکوارٹر پر آنے والے مسافروں کے لئے اس صحرائی علاقے میں ایک نعمتِ غیر مُتَرَقِبہَ سمجھی جاتی تھی۔پیر صاحب اپنے محدود وسائل کے باوجود اِن مہمانوں کی خاطر خواہ مُدارات کیا کرتے تھے۔میرے دوسرے میزبان نوروز خان صاحب تھے جو پبلک ورکس کے محکمے کے ٹھیکیدار تھے اور علاقے کی ایک متموّل شخصیت تھے۔اُنہوں نے مجھے بھی بالکل اپنے بچوں کی طرح پیار دیا جسے میں بُھلائے بھی بُھلا نہیں سکتا۔پیر صاحب کا گھر لکی ریلوے سٹیشن کے قریب واقع تھا اور وہاں سے پاکستان ویسٹرن ریلوے کی دو یادگار کم چوڑائی (Narrow gauge) والی پٹریاں بالکل ساتھ ساتھ گذرتی تھیں۔ایک لائن بنوں اور دوسری ٹانک جاتی تھی۔انگریز سرکار کی بچھائی ہوئی یہ دونوں لائنیں سٹریٹیجک اہمیت کی حامل تھیں اور بُنیادی طور پر دفاعی ضروریات پورا کرنے کے لئے بنائی گئی تھیں لیکن اُس دور میں چونکہ سڑکوں کے ذریعے آمدورفت محدود تھی اسلئے اِن پسماندہ علاقوں کا سارا دارومدار ریل پر تھا۔سٹیم انجن سے چلنے والی ریل کا اپنا ایک رومانس تھا۔بدقسمتی سے اب یہ عظیم الشان سلسلہ تاریخِ ماضی کا ایک باب بن چُکا ہے۔ پٹریاں اُکھاڑی جا رہی ہیں اور سٹیشن بِک رہے ہیں۔پیر صاحب کی رہائشگاہ کے قریب کُمہاروں کے کئی گھرانے آباد تھے۔جہاں ہرنوع کے مٹی کے خوبصورت برتن بنتے تھے۔کمہاروں کو اپنی چکّی پر مصروف اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ کر یوں لگتا تھا گویا دنیا کی ساری رعنائیاں ان جیسے کاریگروں کی مرہونِ منت ہیں۔اگرچہ یہ تو محض ایک معمولی سا عکس ہیں اُس صانعِ اکبر کا جو احسنُ الخالقین ہے۔

صوبہ سرحد کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں ہر 15 میل کی مسافت پر بولی بدل جاتی ہے اور بنوں شہر تو بہر حال لکی سے چالیس میل دور واقع ہے۔اسلئے یہاں کی اکثریت بنوچی بولی بولتی ہے۔شہر میں رہنے والے وزیر، بٹھنی، خٹک، مسعود وغیرہ دوسرے قبائل، سب کی اپنی اپنی مخصوص بولیاں ہیں۔شہر میں سرائیکی اور پنجابی بھی سُننے کو ملتی ہے۔لہٰذا جب میں بنوں کے گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 2 جسے اسلامیہ ہائی سکول بھی کہا جاتا تھا، میں داخل ہوا تو یہ بھانت بھانت کی بولیاں سُن کر پہلے تو خاصا پریشان ہوا لیکن پھر دھیرے دھیرے انکو سمجھنے اور بولنے بھی لگا۔واقعتاً

پشتو زبان کا ذخیرہ الفاظ بہت وسیع اور دلچسپ ہے۔ ان بولیوں میں مہارت تو مشکل کام ہے لیکن روزمرہ کی حد تک سیکھنے کا فائدہ اُس وقت معلوم ہوا جب کئی سال بعد میں نے پشاور میں حصولِ تعلیم کے دوران کالج کی خیبر یونین کے انتخابات لڑنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ سچ ہے اپنی زبان کے الفاظ اور اُس لہجے میں گفتگو کا اپنا ہی ایک سحر ہے۔

اسلامیہ ہائی سکول بنوں (1955-59)

اسلامیہ ہائی سکول کی اپنی ہی ایک داستان ہے۔ یہ اُن اداروں میں سے تھا جو تقسیم ہند سے پہلے مختلف شہروں کے اہلِ دل حضرات نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے بڑی قربانیاں دے کر قائم کئے اور جنہیں پھر بڑی محنت و لگن سے پروان چڑھایا۔ ماسٹر احمد جان ایسے ہی ایک بزرگ تھے۔ وہ کبھی کبھی ہمارے سکول آجایا کرتے تھے۔ سب طلباء و اساتذہ سکول کے ایک بانی کی حیثیت سے اُن کے لئے دیدہ و دل فراش کر لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ کسی نہ کسی کلاس میں پڑھانے بھی لگ جایا کرتے تھے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کو سبھی پیار سے ''کالو بابا'' کہتے تھے۔ اُن کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اُن کے گھرانے میں ہاکی کا کھیل گویا گھریلو دستکاری کا درجہ رکھتا تھا۔ اُن کے بھائی عبداللہ جان صاحب ایک نامی گرامی وکیل تھے۔ جن کے بچوں نے قومی بلکہ عالمی سطح پر نام پیدا کیا۔ دونوں بھائیوں کے والد ظفر علی خان صاحب ریٹائرڈ سیشن جج تھے۔ اور کہا یہ جاتا تھا کہ ان کے بچوں پر مشتمل ٹیم ''ظفر الیون'' کا کوئی جواب نہیں۔ اسی گھرانے کے دولڑکے حمیدی اور رشیدی (بریگیڈیئر عبدالحمید اور پی آئی اے کے عبدالرشید جونیئر) بعد میں پاکستان کے قومی ہاکی ٹیم کے کپتان بنے اور دونوں کی سرکردگی میں قومی ٹیم اپنے اپنے وقت میں عالمی سطح پر اولمپک گیمز کی چیمپیئن قرار پائی۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا لیکن لُطف کی بات یہ تھی کہ جب تک کالو بابا ہمارے ہیڈ ماسٹر رہے ہمارے سکول کو کسی بھی ٹورنمنٹ میں ہرایا نہ جا سکا۔

یہ ایک بڑا اسکول تھا۔ طلباء کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ہر کلاس کو کم از کم چار سیکشنز میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اور ہر سیکشن میں چالیس سے پچاس طلباء ہوتے تھے۔ ہماری آٹھویں کلاس میں تو خیر سے پانچ سیکشنز تھے۔ لیکن ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ اَساتذہ خاصے محنتی اور اپنے پیشے سے پوری طرح انصاف کرنے والے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ چھٹی جماعت میں ہمارا پہلا سہ ماہی امتحان ہوا، میرے ریاضی کے پرچے میں بہت

کم نمبر آئے ،تو اُستادِ محترم زرعلی خانصاحب نے جو انتہائی محنتی اور سنجیدہ انسان تھے،مجھ سے پوچھا، بیٹا! تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟۔ جب میں نے اُنہیں بتایا کہ وہ آرمی کے ایک ریٹائرڈ افسر ہیں تو وہ فرمانے لگے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اُس عُہدے کے برابر سے شروع کرو جواُن کی انتہا تھی''۔ خُدا جانے یہ کیسی مستقبل بینی تھی یا ایک ہمدرد اُستاد کی دعا تھا کہ کچھ ایسا ہی ہوا۔ اوراس کے بعد ہر کلاس میں ہر امتحان میں میری اول پوزیشن آتی رہی۔ دُعا کی بات ہوئی تو اَساتذہ کی یہ مشفقانہ روش جاری رہی۔ جماعت نہم میں سائنس میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر میرے سائنس کے اُستاد فیض اللہ منصور صاحب نے مجھے کیمسٹری کی ایک کتاب تحفتاً دی اور اُس پر لکھا ''خدا کرے زندگی رہے تیری بے داغ''۔ یہ علامہ اقبالؒ کی اپنے بیٹے کے لئے دُعا ''جاوید کے نام'' سے ایک مِصرعہ تھا۔ جو نہ جانے ڈاکٹر جاوید اقبال کے حق میں قبول ہوئی یا نہیں، میرے لئے تو کم از کم ایک چشمہ ہدایت ثابت ہوئی۔ کچھ ایسے ہی الفاظ میرے ایک اور قابلِ احترام انگریزی کے اُستاد اسلامیہ کالج پشاور کے چوہدری سرور مرحوم نے میرے ایک مضمون ''میں کیا بننا چاہوں گا؟'' پر اُس وقت لکھے جب میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ وہ دُعا ان الفاظ پر مشتمل تھی۔

تیری آرزو ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
میری دُعا ہے کہ تیری آرزو بدل جائے

باہمی حوصلہ و برداشت

بنوں ایک قلعہ بند شہر تھا جس کے دس بڑے دروازے تھے۔ ہر ایک دروازے کا جُدا نام تھا۔ مثلاً سوکھڑی گیٹ، ہنجل گیٹ، پریٹی دروازہ، قصابان گیٹ، لکی گیٹ وغیرہ۔ قلعہ بند شہر کے اندر دو عدد پبلک پارک تھے۔ ایک گاسٹن پارک اور دوسرا گاندھی گارڈن۔ بعد میں ان دونوں پارکوں کے نام میلاد پارک اور لیڈیز پارک رکھ دئے گئے۔ گاسٹن پارک مذہبی اور سماجی یکجہتی کا مظہر گردانا جاتا تھا، کیونکہ یہیں پر ہی تو سب مذہبی تہوار اور تقریبات باہمی طور پر منائی جاتی تھیں۔ 12 ربیع الاول کو دونوں جہانوں کے سردار حضرت محمد ﷺ کا یوم ولادت پورے مذہبی جوش و جذبے سے منایا جاتا تھا اور ساتھ ہی عوام اور طلباء پر مشتمل جلوس شہر کی سڑکوں پر گھومتا نظر آتا تھا۔ دُسہرہ کی تقریب بھی خوب تزک و احتشام سے اسی پارک میں منائی جاتی تھی جسمیں اِرد گرد کے قبائلی علاقوں سے بھی ہندو حصہ لینے آتے تھے اور یہیں راون کے ایک بڑے بُت کے گرد رزمیہ گیتوں کے ساتھ رقص کرتے تھے اور پھر

بُت کو آگ لگا دی جاتی تھی۔10 محرم کو عاشورہ کے دن عزاداری کا جلوس یہاں پر آ کر ختم ہوتا تھا اور سب ماتم کُنند گان اسی پارک میں سینہ کوبی کیا کرتے تھے۔شہر کے سب ہی باسی بڑے تحمل، حوصلے، سنجیدگی اور عقیدے سے ان تقریبات میں شریک ہوتے تھے۔گاسٹن پارک کے قریب شہر کے کئی عمائدین کے گھر تھے جو سب ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے تھے۔ان میں نوابزادہ رحم دل، وزیرزادگانِ بنوں، نعمت اللہ خان غزنی خیل، بدیع الزماں ایڈووکیٹ، ملک حمید اللہ خان منڈان، بیرسٹر محمود عباسی، فقیرانِ بنوں اور کرنل امان اللہ سورانی، غلام جان خان خواجہ خیل وغیرہ کے گھرانے شامل تھے۔ہم لوگ ساتھ ہی محلّہ قصابان میں رہائش پذیر تھے۔اس محلے کی مسجد میں میری ملاقات حافظ شیر جان سے ہوئی، جو بچوں کو درسِ قرآن دینے کے ساتھ ساتھ حفظ بھی کروایا کرتے تھے۔نابینا ہونے کے باوجود اُن کا علمی اور ادبی شوق بے پایاں تھا۔سکول میں تقریری مقابلے ہوتے تھے تو تقریر لکھنے میں حافظ صاحب ہم بچوں کی بھرپور مدد کیا کرتے تھے۔ان ہی کے ساتھ میں نے تفسیر ابن کثیر کا اُردو ترجمہ پڑھا۔جو دراصل میں پڑھتا جاتا تھا، وہ سنتے جاتے تھے اور جہاں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اُس پر گفتگو ہو جاتی تھی۔اسی دور میں سکول کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مجھے کئی ایک نامور مصنفین کی معرکۃ الآرا تصانیف دیکھنے اور اُن سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ان میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیمات۔حضرت شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی کی حجۃ اللہ البالغہ، امام غزالی کی کیمیائے سعادت، حضرت داتا گنج بخشؒ کی تصنیف کشف المحجوب اور ڈاکٹر محمد اقبال کے تقریباً سب ہی فارسی اور اُردو مجموعے شامل تھے۔

قلعہ بند شہر سے ملحق بنوں چھاؤنی تھی جہاں کے پولو گراؤنڈ میں ہم کرکٹ کھیلنے جاتے تھے۔اقبال خان میرا ہم جماعت تھا اور وہ اور حمیدی کے چھوٹے بھائی عبدالمجید (بعد میں بریگیڈیئر مجیدی) کرکٹ کے اچھے کھلاڑی تھے۔مجیدی تو اپنا خاندانی کھیل ہاکی بھی خوب کھیلتے تھے۔اقبال (بعد میں انجینئر اقبال خان جو بنوں کے ضلع ناظم منتخب ہوئے) کے والد محترم رئیسِ بنوں ملک دمساز خان گھنٹوں گراؤنڈ کے باہر بیٹھ کر اپنے ہونہار بیٹے کا کھیل دیکھنے جاتے تھے۔اسی پریڈ گراؤنڈ کے ساتھ بنوں چھاؤنی جسے انگریز سرکار نے ابتداء میں ''ایڈورڈ آباد'' کا نام دیا تھا، کا وہ تاریخی قلعہ تھا جہاں پر 1946 میں بانیءِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی بنوں آمد کے موقع پر تقریر کے لئے سٹیج بنایا گیا تھا، اور جہاں سے مُلحِقہ پریڈ گراؤنڈ میں اہالیانِ بنوں اور مضافات سے آئے ہوئے عوام کا ایک جمِ غفیر جمع تھا۔قائد اعظم انگریزی میں تقریر فرما رہے تھے اور عوام کی اکثریت صِرف

اپنی مادری زبان پشتو سمجھتی تھی لیکن اس تاریخی اجتماع کے شرکت کُنندگان کا کہنا ہے کہ اکثریت اُنکی تقریر دلپذیر کا ایک لفظ تک نہیں سمجھ رہی تھی لیکن اُن کا یہ غیر متزلزل یقین کہ اُن کا یہ عظیم رہنما جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے ایک ایسے سکوت کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں ایک چھوٹی سی چڑیا کے چہکنے کی آواز بھی واضح سنائی دے رہی تھی۔

بنوں چھاؤنی ہی کے بیرون پریڈ گیٹ میونسپل پارک (جناح پارک) میں 1946 میں آل انڈیا کانگریس کی حلیف جماعت سُرخ پوش تحریک نے پختونستان ریزولیشن منظور کیا تھا جسکے نتیجے میں شمال مغربی سرحدی صوبے میں ریفرینڈم ہوا۔اور پھر اسی جناح پارک میں 1955 میں پاکستان کے شہیدِ جمہوریت اور سابق وزیراعظم جناب حُسین شہید سہروردی نے وَن یونٹ کے حق میں تقریر فرمائی۔راقم الحروف اس جلسے میں موجود تھا جہاں سہروردی کہہ رہے تھے ''اگر سندھ سندھیوں کا ہے ،پنجاب پنجابیوں کا ،بنگال بنگالیوں کا ،سرحد پٹھانوں کا ۔تو میرے بھائی! پاکستانی کہاں جائے گا؟'' ایک عجیب تاریخی مخمصہ تھا۔سُہروردی صاحب نہ صرف بنگالی تھے بلکہ متحدہ بنگال کے وزیراعظم رہ چکے تھے۔جن سے جناح صاحب ان کے حد سے زیادہ بنگال نواز ہونے پر ناراض تھے۔جنہوں نے اپنی جُدا سیاسی جماعت ''عوامی لیگ'' قائم کی،اور آج اُسی بنگال کی عددی اکثریت کو زائل کرنے کے لئے مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو یکجا کر کے ون یونٹ کے لئے کنویسنگ ہو رہی تھی۔یہ چاروں صوبے ختم ہو گئے۔ 1956 کا پہلا آئین بھی منظور ہو گیا۔اور پھر 1958 کے ماہ اکتوبر میں جمہوریت کی بساط اُلٹ دی گئی۔جنرل ایوب خان صدر پاکستان بنے اور ساتھ ہی فیلڈ مارشل بھی۔اُنکے دور میں ''اگرتلہ کیس'' کا انکشاف ہوا۔سہروردی صاحب کے سیاسی جانشین اور عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن بنے۔مشرقی اور مغربی پاکستان کی سیاسی قیادت کے دباؤ میں 1969 میں یحییٰ خان کے حکم سے ون یونٹ کو ختم کر دیا گیا اور پھر 1971 میں بنگال کی سیاسی یورشوں اور بھارت کے کُھلے بندوں آزاد بنگلہ دیش حمایت کے نتیجے میں شیخ مجیب الرحمٰن ''بنگلہ بندھو'' بنے اور قائداعظم کا پاکستان دولخت ہو گیا۔ سچ ہے ''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''

1955 سے ہی تمام سکولوں کی صُبح کی اسمبلی میں تِلاوت کے بعد پاکستان کا سرکاری منظور شُدہ قومی ترانہ ''پاک سرزمین شاد باد'' گایا جانے لگا۔اس سے پیشتر بچے عموماً اقبال کی دعا۔

''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری''

یا پھر ظفر علی خان کا ترانہ ’’اسلام کا ہم سکہ دُنیا پہ بٹھا دینگے‘‘ پڑھا کرتے تھے۔

مولانا ذبیح (مرحوم)

ایک صبح سکول اسمبلی پر ہمارے ہیڈ ماسٹر عطاء اللہ خان صاحب نے ایک قومی شخصیت کا تعارف کرایا۔ یہ مولانا محمد اسماعیل ذبیح تھے جو متحدہ ہندوستان کے مسلمان صحافیوں میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔اور قائداعظم کی اُس وقت کی آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر رہ چکے تھے ۔ 1946 کے تاریخ ساز انتخابات میں اُن ہی کی کوششوں سے نوابزادہ لیاقت علی خان کانگریسی اُمیدوار کے مقابلے میں یو۔ پی کے حلقہ ہاپڑ سے کامیاب ہوئے۔نوابزادہ صاحب مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے اسلئے یہ کامیابی مسلم لیگ کے لئے انتہائی اہم تھی۔ 1947 میں پاکستان بنا تو لیاقت علی خان اسکے پہلے وزیر اعظم بنے ۔مولانا اسماعیل ذبیح صاحب اُن دنوں پاکستان کی نوتشکیل شُدہ سیاسی جماعت ’’ری پبلکن پارٹی‘‘ کے سیکرٹری اطلاعات تھے اور بنوں آئے ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے اور قومی جذبے سے سرشار انسان تھے۔ وہ مولانا صاحب کے قومی جذبے سے شناسا تھے۔ دونوں کی ملاقات ایک حجام کی دکان پر ہوئی اور ان نابغہ ءزماں اور فصاحت و بلاغت کے میدان کے شناور مُجاہد سے درخواست کی کہ وہ اُنکے سکول کے بچوں سے خطاب کریں جو اُنہوں نے قبول فرمائی۔ بعد میں ذبیح صاحب سے میرا تعلق کچھ ایسا ہوگیا کہ وہ مجھے اپنے خاندان کا ایک فرد گردا ننے لگے۔ مولانا ذبیح صاحب ایک نہایت ہی باغ و بہار شخصیت اور ہمہ جہت ہستی تھے۔قبیلہ ءصحافت کے تو وہ سرخیل تھے ہی جنہوں نے روز نامہ ڈان کے جناب الطاف حُسین اور نوائے وقت کے حمید نظامی کے ساتھ مل کر مسلم مُدیرانِ اخبارات کی انجمن کی بنیاد رکھی جسکے پہلے اجلاس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے خود فرمائی۔ اُنہوں نے بمبئی سے ’’بمبئی پنچ‘‘ کانپور سے ’’عارف‘‘ اور ’’قومی اخبار‘‘ نامی اُردو جریدے بھی نکالے۔ خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی میں کئی تاریخی اور علمی کُتب و رسائل ترجمہ کیئے۔ سِول نافرمانی کی تحریک میں اوائل ہی میں شرکت کی اور کئی نامی گرامی کانگریسی اور دیگر سیاسی رہنماؤں مولانا ابو الکلام آزاد، لعل بہادر شاستری، لکشمی پنڈت ، بھگت سنگھ وغیرہ کی رفاقت میں جیلیں کاٹیں۔ ایامِ اسیری اور قافلہء آزادی کے پروانوں کی معیت میں اُٹھائی جانے والی صعُوبتوں کی داستانیں وہ بڑے مزے لے لے کر سناتے جاتے تھے۔ ایک مرحلے پر وہ مجلسِ احرار کے صدر بھی رہے۔ پاکستان کے بننے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری

رہا۔ اُنہوں نے کراچی سے اُردو روزنامہ ''خورشید'' اور حیدر آباد سے انگریزی اخبار ''وائس آف سندھ'' شائع کئے اور پشاور اور کراچی کے روزناموں ''انجام'' اور ''مشرق'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔ اسی پر بس نہیں تھا۔ مولانا بے شمار کتابوں کے مصنف تھے۔ ایک ذہین انقلابی اور بھرپور محبِ وطن ہونے کے ساتھ ایک نہایت ہی شفیق دوست اور کرم فرما تھے جو پُرانی قدروں کے امین ہونے کے باوجود سائنس اور ٹیکنالوجی سے مُزین ایک جدید اور روبہ ترقی پاکستان کے داعی تھے۔

جمہوریت کا خون

افسوس کہ بانیانِ پاکستان کی اُمیدوں پر ہمارے سیاسی رہنما پورا نہ اُتر سکے۔ ڈھاکہ جہاں 1906 میں مسلمانانِ ہند کی تنظیم مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ 1958 میں وہاں صوبائی اسمبلی میں ایک ہنگامے کے دوران کسی ممبر نے اشتعال میں آکر قائم مقام سپیکر کو کُرسی اُٹھا کر ماردی اور سپیکر صاحب اپنی جان کھو بیٹھے۔ ایک جمہوری آئین پر اتفاق کرنے میں قوم نے پورے نو سال لگا دئے تھے لیکن آئین ڈھائی سال بھی نہ چل سکا اور سات اکتوبر 1958 کو صدرِ جمہوریہ میجر جنرل سکندر مرزا نے افواجِ پاکستان کے سربراہ جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نامزد کر کے آئین کو مسترد کر دیا۔ چند ہی دن بعد جنرل ایوب خان خود صدر پاکستان بن گئے۔ اُن کی کابینہ نے اُنہیں اُن کی خدمات کے صلے میں فیلڈ مارشل کے عُہدے سے نوازا اور ایوب خان صاحب نے پاکستانی عوام کو بنیادی جمہوریتوں کا ایک نیا سیاسی نظام دیا۔ 1962 کے آئین کے مطابق محض ایک لاکھ بیس ہزار ارکان کا الیکٹورل کالج ہی صدرِ پاکستان کا انتخاب کر سکتا تھا۔ سرکاری (کنونشن) مسلم لیگ کے علاوہ ساری دیگر سیاسی جماعتیں اِکھٹی ہو گئیں اور انہوں نے مِل کر قائداعظم مرحوم کی خواہرِ محترم فاطمہ جناح کو اپنا اُمیدوار نامزد کیا۔ ہونا وہی تھا جو ہوا۔ صرف قائداعظم کی وراثت کی امین مادرِ ملت کو اپنی پیرانہ سالی میں ایک بڑے امتحان سے گزرنا پڑا۔

ناقابلِ فراموش اساتذہ

جب بھی کتابِ زندگی کے اوراق پارینہ میں سکول کے دنوں کی باتیں سامنے آتی ہیں تو اپنے اُن گمنام اَساتذہ کرام کی بے غرض اور بے لوث مشقتوں کی تعریف کئے بغیر نہیں بَن پاتی۔ آٹھویں درجے میں تھا تو مڈل کا اِمتحان ایک سنگ میل سمجھا جاتا تھا اور اَساتذہ بڑھ چڑھ کر طلباء کو تیار کرنے کی قسم کھا لیتے تھے۔ اُن دنوں میں

اپنے انگریزی کے اُستاد شیر محمد صاحب سے گرامر کے جو پیچیدہ رموز بہت ہی آسان الفاظ میں سیکھے اُنہوں نے گویا ہماری انگریزی دانی کی بنیاد ہی رکھ دی۔ تواریخ کے اُستاد شمشیر علی خان صاحب کا وہ جُملہ ساری زندگی یاد رہیگا جب انہوں نے شہنشاہِ ہند شاہجہان کے بیٹوں کی خانہ جنگی کی داستان بیان کرتے ہوئے ہمارے نارسا ذہنوں میں بٹھایا۔ ''شاہجہان کی دلی مُراد یہ تھی کہ اُسکے بعد اُسکا شجاع بیٹا داراشکوہ اورنگزیب ہو''۔ اس جُملے سے بادشاہ اور اُس کے چاروں بیٹوں کے نام یاد کرنے اور تاریخی پس منظر واضح کرنے میں جو مدد ملی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ اسی مضمون کے ایک اُستاد عبدالحمید سگو نے جس انداز میں تاریخِ ہندوستان کے فرنگی دور کے اسباق پڑھائے، اُس نے کئی سال بعد بھی مقابلے کے امتحان میں بے انتہا معاونت کی۔ سائنس کے اُستاد شیخ حق نواز صاحب کو تو قطعاً بُھلایا نہیں جا سکتا جنہوں نے سائنسی اسباق کو یوں پیش کیا جیسے سب کچھ ہم خود ہی جانتے تھے۔ نویں درجہ میں اُردو کے اُستاد پیر عبداللہ شاہ کے وہ الفاظ آج بھی سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں، جب غالب، میر اور سودا جیسے اساتذۂ فن کی غزلیں ہمارے معصوم ذہنوں کے اوپر سے گذر جاتی تھیں تو فرماتے'' کم بختو! کبھی عشق تو کر کے دیکھو، خود ہی سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی سب کے پردے فاش ہو جائیں گے''۔ ہمارے ایک اور اُردو کے اُستاد سرور سلیمانی صاحب تھے جو ایک منجھے ہوئے شاعر بھی تھے۔ 1956 میں جب مصر کے عظیم رہنما کرنل عبدالناصر نے نہر سویز کے قومیا لینے کا فیصلہ کر لیا تو برطانیہ ،فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر بھر پور حملہ کر دیا۔ سلیمانی صاحب نے'' لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل'' کے بحر میں ایک ایسی معرکۃ الاراء نظم لکھی جس نے واقعتاً اقبالؒ کے اس شعر

''آگ ہے، نمرود ہے، اولادِ ابراھیم ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے''

کی مکمل توجیہ فراہم کر دی۔ اَساتذہ کی محنت اور دُعائیں تو اپنے سب شاگردوں کے لئے یکساں تھیں لیکن شاید اِن کاوشوں سے سب سے زیادہ مستفید ہونا میرے نصیب میں تھا، جب ہی تو مڈل کے امتحان میں راقم الحروف نے ضلع بھر کے سکولوں کے طلباء میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کر کے سکول کے آنرز بورڈ پر اپنا نام کندہ کرا دیا۔

نویں اور دسویں درجے میں سکول کی غیر نصابی سرگرمیوں میں میرا حصہ سکاؤٹنگ، تقریری مقابلوں اور فرسٹ ایڈ ٹیم میں نمایاں رہا۔ ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا صدر اور فرسٹ ایڈ کیلئے ٹیم لیڈر مقرر ہوا۔ ضلعی سطح پر فرسٹ ایڈ کا

مقابلہ جیتنے کے بعد ریجن کی سطح پر حصہ لینے کیلئے پشاور گئے۔ میرے عزیز دوست گلنواب خان جو ہماری ٹیم کے ممبر تھے آج بھی کبھی کبھی وہ دلچسپ صورتِ حال یاد دلاتے ہیں، جب ہماری ٹیم کو ایک حادثے میں زخمی ہونے والے شخص کی مرہم پٹی کرنے کے لئے کہا گیا تو میں نے بطورِ ٹیم لیڈر اپنے ساتھیوں سے ابتدائی طبی امداد کیلئے ہمیں فراہم کردہ پٹیوں (ڈریسنگ بینڈیجیز) کو لانے کو کہا۔ فوراً میرے چاروں ساتھی حکم بجالانے کیلئے چہار سو دوڑ پڑے حالانکہ متعلقہ بیگ میرے بغل میں لٹکا ہوا تھا۔ دوسری مضحکہ خیز بدحواسی کا مظاہرہ اُس وقت ہوا جب ممتحن ڈاکٹر صاحب نے ہم سے پوچھا: ''زخمی کو لے کر آپ سب سے پہلے کہاں جائیں گے؟'' ہم سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا ''سیدھا قریبی ہسپتال۔'' ہماری اس حاضر جوابی اور معاملہ فہمی پر ممتحن حضرات کی معنی خیز مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ ایسے معاملات میں انسانی ہمدردی کو قانون کے تابع لانا پڑتا ہے اور قریبی ہسپتال کی بجائے پہلے قریبی پولیس تھانے کا رخ کرنا ہوگا۔

سکول کی سالانہ تقسیمِ انعامات کی تقریب منعقد ہوئی تو راقم الحروف کے والد گرامی پہلی دفعہ سکول اِنتظامیہ کے بے حد اصرار پر اُس میں شرکت کے لئے آمادہ ہوئے اور میرا خیال ہے کہ ایک باپ کی حیثیت سے یقیناً اُن کا سر فخر سے بلند ہوا ہوگا۔ یہ دیکھ کر کہ نِصابی سرگرمیوں میں بلا استثناء ہر مضمون میں اُنکے بیٹے کو اول انعام ملا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال کوئز اور ڈیبیٹس کے میدان میں تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے اگلے روز پوچھا کہ اتنے بے شمار انعامات میں کیسے گھر لے گیا۔ میں نے جواب دیا کہ ہم سکول میں دو بھائی ہیں اور ایسے کام ہم مل کر انجام دے لیتے ہیں۔ الغرض میٹرک کے امتحان کے نتیجے میں بھی خاکسار کا نام سکول آنرز بورڈ پر دوبارہ تحریر ہوا۔ اور والدین کی دُعائیں ایک دفعہ پھر رنگ لائیں۔

لالا محمد خان

میری والدہ محترمہ اور والد گرامی دونوں نہ صرف ہم بہن بھائیوں کی اچھی تعلیم و تربیت کے خواہاں تھے، بلکہ وہ تو سب عزیزوں، دوستوں اور محلّہ داروں کے بچوں کی تعلیمی ترقی میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ اُنکے جاننے والوں کا کوئی بچہ کسی بھی درجہ میں کمال دکھاتا تو فوراً مبارک باد کا پیغام بھیج کر اُنکی خوشیوں میں شریک ہو کر حوصلہ افزائی فرماتے۔ اور حتیٰ المقدور دامے، درمے اور سخنے اس کارِ خیر میں مدد بھی فرماتے۔ چنانچہ جب والد صاحب کے ایک پُرانے رفیقِ کار کا بنوں سے تبادلہ ہوا تو اُنہوں نے اُنکے چھوٹے بھائی محمد خان کی رہائش و آسائش کی ذمہ داری خود لے لی تاکہ اُس

کے تعلیمی کیریئر میں کسی قسم کا حرج نہ ہو۔ محمد خان مجھ سے چند سال بڑا تھا اور گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ لیکن انتہائی محنتی اور ذہین انسان تھا۔ شرافت اور متانت کا پیکر ہونے کے علاوہ وہ زندگی کا ہر لمحہ انتہائی منظّم انداز میں گزارنے کا خُوگر تھا شاید اِس میں اُسکی سابقہ درسگاہ ملٹری کالج جہلم کا بھی رول تھا۔ ہم سب بہن بھائی اُسے پیار سے لالا محمد خان کہتے تھے۔ وہ نہ صرف تعلیمی میدان میں اپنے کالج کا بہترین طالبعلم تھا بلکہ سپورٹس اور غیر تعلیمی سرگرمیوں میں بھی لاجواب تھا۔ تقریری مقابلوں میں تو اُسکا مدلّل اندازِ بیان انتہائی مؤثر کن ہوا کرتا تھا۔ انتہا تو یہ کہ ایک نہایت نفیس انسان ہونے کے علاوہ وہ کالج کا بہترین مُکا باز بھی تھا۔ کالج یونین کا صدر منتخب ہوا اور یونیورسٹی کی سطح پر مقابلوں میں حصہ لیا تو باکسنگ میں اپنی ویٹ کیٹیگری میں یونیورسٹی چیمپیئن قرار پایا۔ انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا پھر یونیورسٹی نے اُسے روسی زبان وادب سیکھنے کے لئے ماسکو بھیجا۔ چنانچہ وہ اولین پاکستانی تھے جنہوں نے ماسکو سے روسی زبان میں ڈاکٹوریٹ حاصل کی۔ پشاور یونیورسٹی میں روسی زبان کی تدریس شروع کی بعد میں کچھ عرصہ ماسکو میں سفارت کار رہے۔ اس دوران اُسوقت کی خاتونِ اول سویٹ یونین اور اُسکی مرکزی ایشیائی ریاستوں کے دورے پر گئیں تو محمد خان سفارت خانے میں واحد روسی جاننے والے سفارت کار کے طور پر اُنکے ساتھ رہے۔ واپسی پر خاتونِ اول نے اُنکے لئے ایک تعریفی خط جاری کیا۔ حکومت بدلی تو یہ تعریف اُنکے لئے خاصی مہنگی پڑی۔ چنانچہ اُنہیں پاکستان واپس آنا پڑا اور پھر یہاں خاصا عرصہ اسلام آباد کے جدید زبانوں کی مشہور درسگاہ میں روسی زبان وادب کے شعبے کے صدر مُعلم رہے۔ مستقبل کے یہی ڈاکٹر محمد خان جب تک زمانۂ طالب علمی میں ہمارے ہاں رہے، ہمارے لئے فارسی زبان کے کلاسیکی شعراء وادباء سے تعارف کا ذریعہ بنے رہے۔ کالج یونین کے انتخابات کے سلسلہ میں اُنہوں نے اپنے رائے دہندگان کے لئے جو تعارفی پوسٹر شائع کئے اُس پر یہ شعر درج تھا۔

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے

ہمارا بدقسمت معاشرہ جانے کتنے عظیم اثاثوں کی ناقدری کا گناہ اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ اور یہ شعر کیسے مؤثر انداز میں اس ظالمانہ رَوِش کا ترجمان ہے۔

باب دوم

اسلامیہ کالج پشاور میں چار سال (1959 تا 1963)

کالج کا انتخاب

کالج میں داخلے کا وقت آیا تو صوبہ سرحد کی ایک عظیم اور تاریخی درسگاہ ہونے کی وجہ سے میری نظرِ انتخاب اسلامیہ کالج پشاور پر پڑی اور آئندہ چار سال کیلئے یہی جگہ میری مادرِ علمی قرار پائی۔ اسلامیہ کالج نہ صرف پختون تہذیب و ثقافت کا امین ہے بلکہ مسلمانانِ پاک و ہند کی عظیم تحریکِ آزادی کا لازوال وارث بھی ہے۔ جہاں بانیءِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ تین ۲؎ دفعہ تشریف لائے۔ اسکی طلباء یونین کے تاحیات ممبر بنے اور اپنے وصیت نامے میں ایک خطیر رقم اس کالج کیلئے ترکے میں چھوڑی۔ قیام پاکستان کے بعد 12 اپریل 1948ء کو یہاں آ کر اُنہوں نے وہ معرکۃ الآراء تقریر فرمائی جسمیں ایک طرف اُنہوں نے صوبہ سرحد کے غیور عوام کے لئے ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم کرنیکی نوید دی اور دوسری طرف اُس وقت کی سویٹ یونین کی مقبوضہ تاریخی مسلمان ریاستوں کی آزادی کی گویا پیش گوئی فرمادی۔

گھر سے کالج تک کا پہلا سفر

کالج کے لئے بنوں سے پشاور روانہ ہونے سے قبل والدہ صاحبہ نے میری روزمرہ کی ضروریات کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا اور ہر وہ چیز میرے سامان میں رکھ دی گئی جسکی کسی نہ کسی صورت میں ہاسٹل میں قیام کے دوران ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سوئی دھاگے سے لے کر کمبل و رضائی تک اور کاغذ، پینسل سے لے کر ایک موٹی ڈکشنری تک سب کچھ میرے حوالے کر دیا گیا۔ سفر میں میرے چھوٹے ماموں صاحب میرے گائیڈ اور مددگار کے طور پر میرے ہمراہ تھے۔ والدین اور عزیزوں کی دعاؤں کے ساتھ بڑے اہتمام سے رُخصتی ہوئی۔ یہ تو بعد میں دورانِ سفر یاد آیا کہ بالکل بنیادی چیز یعنی اپنا ''میٹریکولیشن سرٹفیکیٹ'' تو میں گھر بھول آیا تھا۔ یہ گویا کالج کے فرسٹ ائیر کے طالب علم ہونے کا ثبوت تھا جس نے کالج جا کر اپنے سینئر طالب علم ساتھیوں کے

۲؎ اسلامیہ کالج پشاور۔ ایک نظر میں۔ مُصنفہ ڈاکٹر نوشاد خان

ہاتھوں فرسٹ ائیر فولنگ کا الگ مزہ چکھنا تھا۔ بہر حال یہ مرحلہ بھی بخیر وخوبی طے ہو ہی گیا اور کالج کے ایک تاریخی ہاسٹل ''چیمسفورڈ'' میں رہائش پذیر ہو گیا۔ کالج میں داخلے کے لئے انتظامیہ نے جو میرٹ لسٹ بنائی تھی اُس میں میرا پری انجینئرنگ کلاس میں دوسرا نمبر تھا۔ پہلے نمبر پر میرے دوست خالد لطیف تھے جو تھوڑی دیر بعد اپنا اِرادہ بدل کر میڈیکل گروپ میں چلے گئے۔ اور اس طرح اپنی کلاس میں مجھے میٹرک میں حاصل کردہ نمبروں کی بنیاد پر پہلی پوزیشن ملی۔ اور ساتھ ہی میرٹ سکالرشپ کا حقدار بھی ٹھہرا۔

اسلامیہ کالج کی عمارتیں اسلامی اور مغل طرزِ تعمیر کا بہترین شاہکار تصور کی جاتی ہیں۔ ایک وسیع وعریض چمن زار، خوبصورت تاریخی مسجد جس کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے مشہور بطلِ حُرِیّت حاجی صاحب ترُنگزئی کی پُراسرار شخصیت کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا اور کالج کی عظیم الشان لائبریری جو اُس وقت بھی پچاس ہزار کتابوں کے ساتھ بے شمار نایاب قلمی نسخوں کا بے بدل خزانہ مشہور تھا۔ کالج کے بوٹانیکل گارڈنز، ہارڈنگ اور چیمسفورڈ ہاسٹل کے درمیان بہنے والی متوازی ندیاں اور کالج کا کرکٹ لان اور متعدد دوسرے عجائبات کسی جنتِ ارضی کی بے مثال دل فریبیوں سے کم نہ تھے۔

ہوئے تم دوست جسکے

اُن دنوں میٹرک کا امتحان صوبہ بھر میں پشاور یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتا تھا۔ یونیورسٹی بھر میں بہترین پوزیشنز لینے والے طلباء کی اکثریت اسی کالج میں آئی۔ پہلی پوزیشن لینے والے ہمارے دوست سعید خان نے آرٹس کے مضامین منتخب کئے۔ اور دوسری پوزیشن لینے والے دوست محمد زمان نے میڈیکل کے، اسی طرح مڈل میں صوبہ بھر میں اول آنے والے فرزند علی نے آرٹس فیکلٹی میں داخلہ لیا۔ سعید خان نے معاشیات میں ایم۔ اے کرنے کے بعد مقابلے کا امتحان دیا تو پولیس سروس کے لئے منتخب ہوئے اور پولیس کے مختلف اہم عہدوں پر فائز رہنے کے بعد فیڈرل سیکرٹری کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ فرزند علی صاحب درویش منش اور نظریاتی قسم کے انسان تھے اُنہوں نے باوجود زبردست تعلیمی ریکارڈ ہونے کے قوم کی تعلیمی حالت بہتر بنانے کا بیڑا اُٹھایا اور سکول کے ایک اُستاد کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ زمان نے کِنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس کیا۔ پاکستان اور ایران کی ہیلتھ سروسز میں خدمات انجام دینے کے بعد اپنی پرائیویٹ پریکٹس شروع کر کے انسانیت کے دُکھوں کا مداوا کرنے کی ٹھانی اور اسی طرح سے دوسرے دوستوں نے مختلف محاذوں پر اپنے علم وہنر کے جوہر دکھائے۔

چیمسفورڈ ہاسٹل کے میرے پہلے روم میٹس (Room Mates) شمالی علاقہ جات، خصوصاً گلگت کے دوست

تھے۔خالد محمود ایک مثالی قد کاٹھ اور جسمانی صحت کا مالک تھا۔سر بفلک پہاڑیوں کو اپنے قدموں تلے لانا اُسکا محبوب ترین مشغلہ تھا۔چھٹیوں کے بعد گلگت سے ہو کر آتا تو خوبانیوں اور دوسرے خشک پھلوں کے بنائے ہوئے مالے ضرور لاتا۔ساتھ ہی اپنی ماہرِ فن والدہ کے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا مُرغی کا اچار اپنے دوستوں کو پیش کرتا۔انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے بعد برسوں ریاض (سعودی عرب) میں عربوں کو انگریزی سکھاتا رہا۔ہمارے مروت قبیلے کے جو چند طلباء ہمارے کالج میں زیرِ تعلیم تھے، وہ تقریباً سب ہی چیمسفورڈ میں رہائش پذیر تھے۔اور اکثریت زراعت کی فیکلٹی سے وابستہ تھی۔سال دوم میں باز محمد خان میرے روم میٹ رہے جو زراعت کے طالب علم تھے۔اکثر اوقات اُنکے اپنے دوستوں سے گفتگو کا موضوع زراعت کے مختلف مضامین ہوتے تھے۔یہ علمی گفتگو مجھے بھی بہرحال سُننا پڑتی تھی۔اسلئے زرعی شعبوں کے بارے میں میری معلومات میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔

زمان ساتھ ہی ہارڈنگ ہاسٹل میں رہتا تھا۔انتہائی محنتی اور اپنے منتخب کردہ شعبے سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھتا تھا۔صُبح دم واک کیلئے جب ہم ہرے بھرے چمن زاروں یا مُلحقہ سر سبز کھیتوں میں نکلتے تو وہ انواع و اقسام کی جڑی بوٹیوں کو جمع کرنے لگتا تھا۔اور ہر پھول اور بوٹے کا شجرہ نسب بیان کرنے پر تُل جاتا تھا۔لائبریری اور اُسکا ملحقہ ریڈنگ روم جسمیں دنیا جہان کے مشہور اخبار و جرائد دیکھنے کو ملتے تھے، ہم دونوں بڑے انہماک سے استعمال کرتے تھے۔نمازِ پنجگانہ کے لئے لائبریری کے عین سامنے کالج کی تاریخی مسجد کا رُخ کرتے۔شام کو کبھی کبھار ذائقہ بدلنے کے لئے فٹبال گراؤنڈ یا کرکٹ لان کا رُخ کر لیتے۔یہ سب کام روزانہ اس دلجمعی سے انجام دیتے کہ کچھ اور سوچنے کو وقت ہی کہاں نکلتا۔رات کو تو ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سے ہاسٹل کے گیٹ بند ہو جاتے اور اوقاتِ مطالعہ (سٹڈی ہاورز) شروع ہو جاتے۔عارف اعجاز میرا کینٹ پبلک سکول کے زمانے کا ساتھی تھا۔زمان اور اعجاز نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ وہ جب بھی آپس میں گفتگو کرتے تو رابطے کی زبان صرف انگریزی ہوتی۔ان حالات میں میری بھی انگریزی کی مشق پکی ہو جاتی تھی کیونکہ ایسی حالت میں ''زبانِ یارِ من تُرکی وَمن تُرکی نمی دانم'' کا بہانہ قطعاً کارگر ثابت نہیں ہوتا تھا۔

اساتذۂ مہربان

مسٹرکلوز

فرسٹ ائیر اور سیکنڈ ائیر میں جو دو اور مشقتیں ہمارے گلے پڑی ہوئی تھیں وہ لازمی فوجی تربیت یعنی کمپلسری ملٹری ٹریننگ یا (سی۔ایم۔ٹی) اور صبح سویرے کی جسمانی ورزش (پی۔ٹی) تھی۔سی۔ایم۔ٹی کے انچارج ہمارے انگریزی کے اُستاد اور اس شعبے کے صدرنشین ایچ۔ایم کلوز صاحب تھے۔اور پی۔ٹی کے انچارج حضرات عبدالرزاق صاحب، اعظم جان صاحب اور صوبیدار محمد حسین تھے۔ ہفتے میں دو دن فوجی تربیت اور تین دن پی۔ٹی ہماری صحت بحال رکھنے کیلیئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔اب کلوز صاحب کا حال سنیئے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے وہ برٹش انڈین آرمی میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ایک پٹھان کمپنی سے وابستہ ہوئے تو صوبہ سرحد کے باسیوں کے گرویدہ ہو گئے۔چونکہ انگلستان کی مشہور کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔اے کر چکے تھے۔لہذا قیام پاکستان کے بعد اسلامیہ کالج پشاور سے وابستہ ہو گئے۔ ہمارے تو انگریزی کے اُستاد تھے۔ساری زندگی کنوارے رہے اور ہارڈنگ ہاسٹل کے ایک سویٹ میں رہتے تھے۔اتفاق سے عبدالرزاق صاحب بھی جو کالج کے فزیکل ڈائریکٹر تھے، اسی ہارڈنگ ہاسٹل کے سپریٹنڈنٹ تھے۔اعظم جان صاحب برابر میں عُثمانیہ ہاسٹل کے نگران تھے۔تینوں اپنی اپنی جگہ اسلامیہ کالج کی انمول شخصیات تھیں جنھوں نے اپنی تمام تر خوشیاں اور غم ،ہم مجبورِ محض طلباء کے نام کر دئے تھے۔زندہ دل طلباء نے ان سرفروشوں سے اَن گِنت لطیفے وابستہ کر کے اسلامیہ کالج کی دلچسپ تاریخ میں بیش قدر اضافہ کیا ہے۔کلوز صاحب کی عظمت کے ہم دھیرے دھیرے قائل ہوتے گئے۔جب ہم نے بعد میں اُنکے انسانی ہمدردی کے بے شمار واقعات سُنے اور دیکھے اور یونیورسٹی اور اسلامیہ کالج کے مختلف سوشل ورک کاروائیوں میں اُنکا نمایاں حصہ دیکھا۔خدا نے پشاور شہر اور فرنٹئیر کے لاتعداد اندھوں محتاجوں، بے کسوں اور بے سہارا افراد کے لئے مسٹر کلوز کو ہی ملجاء و ماوا بنایا تھا۔ایک عجیب انسان دوست شخصیت تھی جسکی خدمات ہمیشہ آبِ زر سے لکھی جائیں گی۔ اُنکی دو تحریر کردہ کتابیں تاریخ نویسی اور انگریزی ادب کا مرقع ہیں۔

بہر حال فرسٹ ائیر کے طلباء کی نیند خراب کرنے کے لئے تو مسٹر کلوز کا نام ہی کافی تھا۔عین سحری کے وقت مقررہ ہاسٹلز میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں اور پھر کلوز صاحب ایک ایک کمرے میں جا کر فرسٹ ائیر کے طالب علموں کو اُنکے خوابِ خرگوش سے اُٹھاتے تھے۔یہ سلسہ چونکہ نومبر، دسمبر اور جنوری کی سردترین مہینوں میں ہوتا تھا،لہذا سحرخیزی کا یہ اولین سبق زندگی بھر یاد رہتا تھا۔سب طلباء گرم رضائیوں سے نکل کر نکر، شرٹ اور پی۔ٹی شوز پہن کر ہاسٹل کے باہر فالن ہو جاتے تھے۔جو بھی طالب علم لیٹ ہو جاتا اُسکو لازماً جُرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا لیکن

کلوز صاحب کا یہ جُرمانہ اتنا معمولی ہوتا تھا کہ والدین کی بجائے صرف طالبعلم کو سزا ملتی تھی کیونکہ اُسکا نام کالج کے نوٹس بورڈ پر ہر کوئی پڑھ لیتا تھا۔ راقم الحروف کو اپنے تعلیمی کیریئر میں محض ایک دفعہ جُرمانہ ہوا تھا اور وہ بھی مسٹر کلوز کی طرف سے پورے مبلغ دو آنے سکّہ رائج الوقت۔ ورسک ڈیم سے نکالی جانے والی نہر اُن دنوں زیر تعمیر تھی جو کالج کے قریب سے گزرتی تھی لہذا ہم سب کو مُنہ اندھیرے وہیں پر مُلکی دفاع کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ اور طلباء دو گروپوں میں منقسم ہو کر نہر کے اطراف میں ڈمی رائفلز کے ساتھ اٹیک اور ڈیفینس کے کرتب سیکھتے۔

ٹھیک صبح آٹھ بجے ناشتے کے بعد ڈریس پریڈ ہوتی اور سب طلباء اپنی سیاہ شیروانیوں، سفید شلوار اور کالی چپل میں ملبوس نظر آتے۔ حاضری لی جاتی۔ نئے دن کے ایجنڈے کے متعلق اعلانات کئے جاتے اور اُس کے بعد سب طلباء اپنی اپنی کلاسوں کی جانب رواں دواں نظر آتے۔

ڈین صاحب

ہر اتوار کی صبح نِصف گھنٹہ مذہبی مواعظ کیلئے مختص ہوتا تھا، اور یہ ہفتہ وار سَرمَن کالج کے **ڈین صاحب** محترم نور الحق ندوی دیا کرتے تھے۔ **ڈین صاحب** بذاتِ خود ایک انجمن تھے۔ وہ ہندوستان کے ندوۃ العلماء اور مصر کی تاریخی درسگاہ جامعہ الازہر سے فارغ التحصیل تھے۔ طلباء کی اکثریت کو اُنکی تین پُشتوں سے جانتے تھے۔ اسلامیہ کالج جسکا متبادل نام ''دارالعلوم اِسلامیہ'' تھا میں دینی علوم کا ایک خصوصی شعبہ تھا اور اُس شعبے کے طلباء کیلئے ایک پورا ہاسٹل ''رحیم شاہ وارڈ'' کے نام سے مختص تھا۔ ڈین صاحب اسی شعبے کے سربراہ تھے۔ لیکن اسلامیہ کالج کی مخصوص روایات کے مطابق سب ہی طلباء کے لئے ہفتے میں ایک روز اسلامیات کی ایک کلاس میں شرکت لازمی تھی، جس کا انعقاد کالج کی مسجد ہی میں ہوا کرتا تھا۔ اسی مسجد میں وہ جمعہ کا خطبہ بھی دیا کرتے تھے۔ اُنکی تقریباً ہر تقریر کا مرکزی خیال یہ سُننے میں آتا تھا کہ افراد۔ افراد سے نہیں، فوج فوج سے نہیں قوم قوموں سے نہیں، بلکہ دراصل عقیدہ عقیدے سے ٹکراتا ہے۔ لہذا اپنے عقیدے پر غیر متزلزل یقین ہی دنیا میں سرخروئی کا باعث بنتا ہے۔ ڈین صاحب کے دوسرے رفقاء میں اُس دور میں مولانا عبدالقدوس، مولانا عبدالشکور اور ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمٰن ہماری دینی معلومات میں بیش قیمت اضافہ فرماتے رہے۔

طلباء کی چنچل فطرت ہر دور میں یکساں رہی ہے۔ جہاں وہ اپنے محترم اَساتِذہ کی دل و جان سے قدر کرتے تھے، وہیں پر اُنکی مخصوص عادات واطوار کو اپنی بذلہ سنجی کا نشانہ بنانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ہمارے

ایک بزرگ فزکس کے ڈیمانسٹریٹر نور حُسین صاحب جب تین روز تک تجربہ گاہ میں ہمیں ایک سائنسی آلے کے فوائد گنواتے رہے تو طلباء نے اُنکا نام ہی ''ورنئیر کیلیپر'' رکھ دیا۔ انگریزی کے اُستاد (ڈاکٹر) اورنگزیب شاہ صاحب ''سائلیس مارنر'' نامی ناول پڑھاتے جاتے اور مختلف کرداروں کی بنظرِ عمیق تحلیلِ نفسی فرماتے رہتے۔ اُنکا تکیہ کلام ''یو۔سی'' (you see) تھا، اور منچلے طلباء ان الفاظ کے استعمال کی تعداد نوٹ فرما رہے ہوتے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی نے ایک روز جب یہ تعداد 101 نوٹ کر لی تو باقاعدہ سینچری ریکارڈ کرنے کا اعلان فرمایا۔ ایک روز ہماری ریاضی کی کلاس میں اُستادِ محترم متواتر تختہ سیاہ کا استعمال فرما رہے تھے۔ جونہی ایک لمحے کے لئے رُکتے اور طلباء کی طرف نظر کرتے ''میاؤں میاؤں'' کی کئی ایک آوازیں بہ یک وقت سنائی دینے لگتیں۔ پروفیسر صاحب نے پہلے تو عقبی نشستوں سے لڑکوں کو اُٹھایا اور اُنہیں کلاس سے باہر جانے کو کہا۔ پھر ایک ایک کر کے دوسری قطاروں کو بھی خالی کروا دیا۔ لیکن جونہی وہ تختہ سیاہ پر لکھائی روکتے وہی میاؤں میاؤں کی آوازیں شروع ہو جاتیں۔ سب لڑکے نکل چکے اور میں آخری طالب علم رہ گیا تو اُنہوں نے میری مدد چاہی۔ ہم دونوں نے لکڑی کے بینچوں اور میزوں کی تلاشی شروع کر دی۔ آخر یہ عُقدہ کُھلا کہ کوئی صاحب چھ عدد بلی کے بچے ایک جگہ رکھ گئے تھے اور وہ معصوم جانیں جونہی چاک اور تختہ سیاہ کی کھٹ کھٹ نہ سُن پاتے تو اپنی موسیقی شروع کر دیتے۔ اس قسم کی بے شمار معصوم و بے ضرر شرارتیں ہمارا روزمرہ کا معمول شمار ہونے لگی تھیں۔

طلبا کی حکومت

کالج کا تاریخی خیبر یونین ہال طلباء کی قائدانہ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے، جمہوری ذہن تیار کرنے اور باہمی تنازعات کو بحث مباحثہ کے ذریعے حل کرنے کے رجحان کو تقویت دینے کے لئے ایک اہم مرکز کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ میرے سال اول کے دوران یونین کی صدارت کیلئے ایک جاندار مقابلہ چارسدہ کے عباس خان اور پشاور کے قاضی ہمایوں کے درمیان ہوا۔ دونوں امیدواروں کے شاندار سیاسی، سماجی اور خاندانی پس منظر کا علم تو ہمیں بہت بعد میں ہوا۔ وہاں تو وہ دونوں محض طالب علم تھے اور طلباء نے اُن میں سے ایک کو ایک سال کیلئے اپنی یونین کی قیادت ووٹوں کی اکثریت کی بنیاد پر حوالے کرنی تھی۔ اکثریت کا فیصلہ قاضی ہمایوں کے حق میں رہا۔ عباس خان پولیس سروس کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچے اور پھر قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے ممبر رہے۔ جبکہ ہمایوں فارن سروس سے وابستہ ہوئے اور افغانستان اور تُرکی میں پاکستان کے سفیر رہے۔

یوں تو خیبر یونین کے سب ہی اجلاس دلچسپ ہوا کرتے تھے لیکن بجٹ سیشن اور آل پاکستان اُردو اور انگریزی ڈیبیٹس کی بات ہی اور تھی ۔ اُس سال میں نے جس مباحثے میں پہلی دفعہ حصہ لیا وہ پشتو مباحثہ تھا اور عنوان پشتو زبان کے عظیم صاحبِ سیف وقلم خوشحال خان خٹک کا یہ شعر تھا:

پخوا بہ حکومت بہ شجاعت کیدو

نن پرون دنیا کنبں حکومت علم و ہنر کوی

(ماضی میں حکمرانی شُجاعت کی مرہونِ منت تھی آج کل دنیا میں علم و ہنر کی حکومت ہے)

اسلامیہ کالج بنیادی طور پر ایک رہائشی درسگاہ تھی ،جسکا سارا انتظام گویا خود کار بُنیادوں پر طلباء کے نمائندوں کے ذریعے اَساتذہ کی برائے نام نگرانی میں چل رہا تھا۔ ہر کالج کا اپنا ''سینئر مانیٹر'' طلباء ہی میں سے چُنا جاتا تھا اور طعام خانے کا انتظام چار، چھ فوڈ مانیٹرز کے ہاتھوں میں ہوتا تھا۔لیکن قواعد وضوابط کی نگرانی پراکٹوریل بورڈ کے ذمّہ تھی۔ ہاسٹلز کے سُپر ینٹنڈنٹ حضرات اور چیف پراکٹر اَساتذہ میں سے مقرر کئے جاتے تھے۔اسی طرح خیبر یونین کے سرپرست بہر حال پرنسپل صاحب تھے اور خزانچی کے فرائض تدریسی عملے میں سے ہی ایک پروفیسر صاحب کے حوالے ہوتے تھے۔شروع میں تو ہمارے پرنسپل اُس وقت کے نامی گرامی سائنسدان میاں مجید صاحب تھے جنکی ریاضی اور فزکس پر دسترس کی داستانیں زبان زدِ عام تھیں لیکن اُنکی سادگی معصومیت اور اپنے طلباء سے محبت وشفقت بھی ضرب المثل تھی۔ بعد میں یہ عہدہ جغرافیہ دان پروفیسر اشرف دُرانی صاحب کو ملا ۔چیف پراکٹر جلال الدین خلجی تھے جو ہمارے انگریزی کے انتہائی شفیق اُستاد بھی تھے۔چیمسفورڈ ہاسٹل کے سپرینٹنڈنٹ ضلع دیر کے عنایت اللہ خان تھے جو پولیٹیکل سائنس کے اُستاد تھے۔خیبر یونین کے خزانچی کے فرائض ریاضی دان پروفیسر ضیاء الدین کے ذمّہ تھے۔

مختلف شعبوں کی انجمنیں

علم کے ہر شعبہ میں طلباء کی دلچسپی برقرار رکھنے کیلئے مختلف ناموں سے انجمنیں قائم کی گئی تھیں۔گیسوئے اُردو کو مزید تابدار کرنے کی خاطر بزمِ ادب قائم تھی،تو سائنسی کارناموں کو جِلا بخشنے کیلئے فرنٹیئر سائنٹفک سوسائٹی کام کر رہی تھی۔ جبکہ روحانی جذبوں کو بیدار کرنے کا اہم کام مجلسِ اسلامیات کے ذمّہ تھا۔ ہر کلاس کو مختلف ٹیوٹوریل گروپس میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔گروپ کا انچارج اَساتذہ میں سے لیا جاتا تھا لیکن سیکرٹری ایک طالب علم ہی ہوا کرتا

تھا۔ ہر گروپ میں مختلف درجوں کے طلباء شامل ہوتے تھے تاکہ جونیئر طلباء سینئر طلباء سے کچھ سیکھ سکیں اور سینئر طلباء کو اپنے سے جونیئر طلباء کی رہنمائی کا موقع مل سکے۔ ایسے ہی ایک ٹیوٹوریل گروپ کے سیکرٹری کے فرائض راقم الحروف نے انجام دئے۔ بزمِ ادب میں شرکت پر اولین نشست میں ہی خوش قسمتی سے پہلا انعام حاصل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ فرنٹئیر سائنٹفک سوسائٹی میں سال دوم کی نمائندگی کی اور اُس سال پشاور اور نوشہرہ کے مختلف صنعتی کارخانوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ان دوروں کا انتظام سوسائٹی ہی کیا کرتی تھی۔ مجلسِ اسلامیات کی رُکنیت کا شرف سال سوئم میں حاصل ہوا۔ اُس پاک مجلس کے منعقدہ موضوعاتی مباحثے میں بھی اوّل انعام کا مستحق قرار پایا۔

کھیل اور دوسرے بہلاوے

انٹر ہاسٹل ٹورنمنٹ میں ایک سال تو ہاسٹل کی ہاکی اور کرکٹ دونوں ٹیموں کی کپتانی کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ ان میچز کا انعام بھی ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ہاسٹل کے سُپر یٹنڈنٹ صاحب نے اعلان فرما دیا تھا کہ ہماری ٹیم جو میچ بھی جیتے گی اُس ہفتے ساری ٹیم کے کھلاڑیوں کو ایک ایک سویٹ ڈِش زائد ملیگی۔ شومئی قسمت ہم اس پیشکش سے بھرپور استفادہ نہ کر سکے کیونکہ چیمسفورڈ ہاسٹل میں اُن دنوں کھیل سے لگاؤ رکھنے والے طلباء محدود تھے۔ اور کپتان صاحب تو بڑی مشکل سے کچھ کھلاڑیوں کو کرکٹ کا بلا اور ہاکی کی اِسٹک دُرست طور پر پکڑانے کی مشق کرا سکے۔ چونکہ کئی پڑھاکو طلباء نے تو شاید گراؤنڈ میں جا کر اس سے پہلے کوئی کھیل بچشمِ خود دیکھا ہی نہیں تھا اور ٹیلی ویژن تو ابھی تک ہم تک پہنچا ہی نہیں تھا۔

اُن دنوں ہاسٹل کی تمام اندرونِ خانہ تفریحی مشاغل کا مرکز ہاسٹل کا کامن روم ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے حکومتِ سویڈن کی طرف سے ہر کامن روم کو ایک ایک نہایت بھدا مگر قوی ہیکل ریڈیو سیٹ تحفے میں مل چکا تھا۔ ہاسٹل کے مکین اپنے فارغ اوقات میں ریڈیو کے واسطے سے بی بی سی سروس کی خبریں اور ریڈیو سیلون کے تفریحی پروگراموں سے بصد شوق محظوظ ہو سکتے تھے۔ ٹیبل ٹینس، کیرم بورڈ اور تاش کے پتے مزید سامانِ تفریح مہیا کرنے کیلئے کافی سمجھے جاتے تھے۔

غیر مُلکی معزز مہمان

سال دوم میں پہنچے تو ہماری غیر نصابی سرگرمیاں پورے ذوق وشوق سے جاری وساری تھیں۔ اُس سال پہلے تو دُنیائے عرب کے اُس وقت کے ہیرو کرنل جمال عبدالناصر پاکستان آئے تو پشاور بھی تشریف لائے۔ سارا

پشاور گویا استقبال کے لئے اُمڈ آیا تھا۔ہم لوگ بھی ائیر پورٹ پر اپنے معزز مہمان کی ایک جھلک دیکھنے حاضر ہوئے۔پھر ماہ فروری میں ملکہء برطانیہ الزبتھ ثانی اور ڈیوک آف ایڈنبرا پشاور آئے تو اسلامیہ کالج بھی تشریف لائے۔یہیں سے یہ شاہی جوڑا سوات روانہ ہوا جہاں وہ والیٔ سوات کے مہمان رہے۔

مُہم جوئی

ان دنوں مَیں اسلامیہ کالج کی چھ رُکنی ٹیم کے ہمراہ جوانانِ پاکستان کے یوتھ ہاسٹلز کے کیمپ میں شریک ہونے کوہ مری چلا گیا۔وہ بھی زندگی کا ایک انمول اور نا قابل فراموش تجربہ ثابت ہوا۔ملک کے ہر گوشے سے ایڈونچر پسند نوجوان ان برف پوش پہاڑیوں پر ایک ہفتے کیلئے اپنی مہم جویانہ فطرت کو تسکین دینے کیلئے اِکھٹے ہوئے تھے۔لارنس کالج ہمارا بیس کیمپ قرار پایا اور وہاں سے ارد گرد کی چھوٹی موٹی سب ہی پہاڑیوں کو پاؤں تلے روندنے کا مِشن ہمارے حوالے تھا۔اُس سال اُسوقت تک مری کی پہاڑیوں پر بیس فٹ تک برف پڑ چکی تھی۔میں اپنے دوست خالد محمود سے اُسکا ٹریکنگ سوٹ اور کالی عینکیں مستعار لے کر برف پر چلنے بلکہ میراتھن ریس لگانے میں لگ گیا۔تازہ گرتی ہوئی برف میں راستہ بنانا انتہائی کٹھن کام ثابت ہوا۔ہم لوگ باری باری دوسرے ساتھیوں کی راہبری کر رہے تھے۔یہ راہنما حضرات صرف چند قدم تک برف میں پاؤں دھنساتے دھنساتے پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے اور پھر دوسرا جوان پہلے کی جگہ لے لیتا۔''سیون سسٹرز'' نامی سلسلہ کوہ ایک دن یونہی سر کرنے کی کوشش کی۔آخری چوٹی پر پہنچے تو وہاں سے واپسی کا راستہ مکمل طور پر برف پوش اور تقریباً عمودی ڈھلان تھا۔ہم میں سے تقریباً ہر ایک لُڑھکتے لُڑھکتے راستے میں کسی نہ کسی درخت یا مضبوط جھاڑی میں اٹک گیا۔وہاں سے جب نیچے دیکھا تو سینکڑوں فیٹ تلے راولپنڈی جانے والی سڑک کے سِوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور وہی ہماری منزل تھی۔شام کو خُدا خُدا کر کے اپنے بیس کیمپ پُہنچے تو حسبِ معمول رات کا کیمپ فائر منتظر پایا۔جلدی سے کھانا کھایا اور اپنے اپنے متعین کردہ ڈرامائی خاکوں کو پیش کرنے کے لئے حاضر ہو گئے۔ہمارے شاعر دوست فقیر حُسین ساحر نے تو اُس دوران اپنی زبوں حالی کی داستان شعر میں سمودی تھی اور پھر ہم سب نے اُن کے کلام کو قوالی کی شکل دے دی،جس کے ٹِیپ کا بند کچھ یوں تھا۔

''میں اُوپر سے ِگر رہا تھا اور وہ خاموش تھا''

بہر حال اسی صورت حال میں نہ صرف اِنٹرنیشنل یوتھ ہاسٹلز کی ممبر شپ حاصل کی بلکہ بہت سے اچھے

اچھے دوست بھی بنانے کا موقع ملا۔ یہیں پر میری اپنے بچپن کے پڑوسی ملک انور صاحب کے بیٹے ''مٹھو'' سے ملاقات ہوئی۔ جواب ''مٹھو'' نہیں بلکہ ملک محمد اسلم بن چکے تھے۔ یہیں پر ہی ہماری ملاقات پنجابی ادب کے ایک مشہور ظریفانہ کلام کہنے والے شاعر کے بیٹے سے ہوئی، جو ہر موقع بے موقع اپنے دوستوں کی فرمائش پر اپنے والد بزرگوار کا کلام پیش کر کے محفل کو زعفران زار فرما دیتے تھے۔

کوچہ سیاست میں رسوائی

اُس سال ہم سے ایک غلط حرکت یہ سرزد ہوئی کہ کچھ دوستوں کے بہکاوے میں آ کر ہم نے طلباء سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ فرمایا، اور خیبر یونین کے جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے کے لئے انتخابات لڑے۔ مقابلے میں دو اور اُمیدوار میدان میں اُترے تھے۔ دونوں آرٹس گروپس سے تعلق رکھتے تھے اور راقم الحروف سائنس گروپ سے۔ اگر مقابلہ ہم تین میں ہوتا تو جیتنے کے چانسز ہو سکتے تھے۔ لیکن ہم سے جو سٹریٹیجک غلطی ہوئی، وہ یہ تھی کہ ہم نے ایک اُمیدوار محمد سعید خان کے خلاف یہ عذرداری داخل کی، کہ چونکہ وہ ایک اخلاقی جُرم یعنی کہ اپنے ایک روم میٹ کا بکس توڑ کر اُس سے حلوہ چوری کرنے کا ارتکاب کر چکے تھے۔ اور جُرم ثابت ہونے پر اُن کو بیس روپے مالیت کا جُرمانہ بھی دینا پڑا تھا، لہذا اُن کو ڈِسکوالیفائی قرار دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور دوسرے اُمیدوار عبدالصمد آفریدی کے ہاتھوں ہمیں اپنی زندگی کی پہلی سیاسی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اُدھر قُدرت کی ستم ظریفی کو دیکھئے ہمارے دوست سعید خان صاحب پولیس کے انسپکٹر جنرل بنے اور آفریدی صاحب ابھی آرمی میں میجر ہی تھے کہ بلوچستان میں تخریب کاروں کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بنے۔ بعد میں ہم تینوں اچھے دوست بنے۔ عبدالصمد خان میری انتہائی قدر کرتے تھے اور میں سعید خان صاحب کی بے پناہ لیاقت وذہانت اور انسان دوستی کا ہمیشہ دل وجان سے معتقد رہا۔

''خیبر'' کی اِدارت

اُسی سال راقم الحروف کو ایک مختصر سے مقابلے کے بعد کالج میگزین ''خیبر'' کے ادارتی بورڈ کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اگلے تین سال خیبر کے اُردو سیکشن کے ایڈیٹر کے طور پر میرا نام اِس تاریخی مُجلّے سے وابستہ رہا۔ لیکن میرے مضامین انگریزی حصے میں بھی چھپتے رہے۔ کالج کو خیر باد کہنے کے رُبع صدی کے بعد جب

''خیبر'' نے کالج کی ڈائمنڈ جوبلی کی مناسبت سے ایک خصوصی نمبر نکالا تو یادِ ماضی کے حوالے سے میرا بھی ایک مضمون ''ہاف ٹُرتھ'' کے عنوان سے شائع ہوا جس کو خاصی پذیرائی نصیب ہوئی۔

سکول کی دوسری جماعت میں ریاضی کے حساب کتاب سے جب واسطہ پڑا تو معلوم ہوا کہ ایک پیسے کا سکّہ بھی یوں بڑی رقم شمار ہوتی ہے کہ اس کو دو دھیلوں، تین پائیوں یا چار دمڑیوں میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور چونسٹھ پیسے ایک روپے کے برابر ہوتے ہیں۔ کالج کے دوسرے درجے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ سرکار نے اعشاری نظام رائج کر دیا ہے اور اب پیسہ اپنی وہ قدر و منزلت کھو بیٹھا ہے اور آئندہ ایک روپیہ بنانے کیلئے سو پیسے درکار ہونگے۔ کچھ ایسا ہی حادثہ چھٹانک، پاؤ اور سیر کے ساتھ بھی پیش آیا اور اب ایک سیر کا پیمانہ وزن میں ایک کلوگرام کے ہم مرتبہ شمار کیا جانے لگا۔ یعنی سولہ چھٹانک کے ایک سیر کی بجائے اب ہزار گرام کا ایک کلوگرام نئے سائنسی دور کا پیمانہ گردانا جانے لگا۔ یہی نہیں اصلاحات کا ایک لامتناعی سلسلہ شروع ہو چُکا تھا۔ ہر طرف سبز انقلاب کا نعرہ تھا، ذرعی اصلاحات تھیں۔ معاشی، انتظامی اور سیاسی سطح پر انقلابی فیصلے ہو رہے تھے۔ ایک مضبوط صنعتی اساس رکھی جا رہی تھی۔ ان ہی اصلاحات کے پہلو بہ پہلو تعلیمی اصلاحات کا بھی اعلان ہوا۔ مُلک بھر کے کالجوں میں ڈگری کورس دو کی بجائے تین سالہ قرار دیا گیا۔ اور سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کی بجائے سیمسٹر سسٹم رائج کر دیا گیا۔ تعلیمی اِداروں کو ڈسپلن کا زیادہ سے زیادہ پابند بنانے کے لئے سیمسٹر سسٹم کو اَساتذہ کے ہاتھوں میں ایک خصوصی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ ڈگری کورسز کو دو حصّوں مین تقسیم کر دیا گیا۔ ''پاس کورس'' کی صورت میں ایم اے، ایم ایس سی کیلئے دو مزید سال لگانے پڑتے تھے لیکن ''آنرز کورس'' مکمل کرنے کے بعد یہ پوسٹ گریجویشن ایک سال ہی میں کی جا سکتی تھی۔ ہمارے چونکہ فزکس یعنی طبیعات میں نمبر بہتر تھے لہذا فزکس آنرز میں داخلہ لیا۔ آنرز کی صورت میں سب کلاسز اب اِسلامیہ کالج کی بجائے پشاور یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات میں منعقد کی جاتی تھیں۔ البتہ رہائش ہماری کالج کی اقامت گاہوں میں تھی اور انتظامی لحاظ سے ہم کالج کے طالب علم ہی تھے۔ فزکس کے علاوہ ہم نے ریاضی ''الف'' اور ''ب'' دوسرے لازمی مضامین منتخب کئے۔ ساتھ ہی عمرانیات، انگریزی اور ایک اختیاری جدید زبان پڑھنا بھی ضروری تھا۔ لہذا ہم نے ''جرمن'' زبان کا انتخاب کیا۔ انسانی ارتقاء کے منازل اور مختلف تہذیبوں کی داستانیں ذہن پر از خود اثر انداز ہونے کیلئے کافی تھیں اُوپر سے اُستادِ محترم عبدالصمد صاحب کی فلسفیانہ تجزیہ نگاری اس علم کے کئی نئے دریچوں سے واقفیت کا سامان پیدا کرتے تھے۔ جرمن زبان کی دلچسپ گرامر کی

گُتھیاں سُلجھانے کیلئے خوبرو میڈم کیرن عادل خان کا رول بھی نا قابلِ فراموش رہا۔

ایک اُدھورا خواب

بہر حال ہمارے ماہرِ طبیعات بننے کے اِمکانات اُس وقت معدوم پڑ گئے جب ملک بھر میں طلباء یونینز نے پُر تشدد مظاہروں کے بعد تعلیمی اصلاحات کو موقوف کرنے پر حکومت وقت کو مجبور کر دیا اور ڈگری پاس کورس کا دورانیہ گھٹا کر دو سال کر دیا گیا۔ ہم نے اپنی بے شمار دوسری غیر نصابی سرگرمیوں کے پیشِ نظر اپنے کورس کے دوسرے سال میں آنرز کی بجائے پاس کورس کی بی ایس سی مکمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دیگر متفرق سرگرمیوں کی تفصیل بعد میں عرض کی جائیگی لیکن ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ اِسکا فوری محرّک ضرور بنا۔ کچھ یوں ہوا کہ ایک دن اپنے ہاسٹل سے ملحقہ فُٹبال گراوٗنڈ میں ہم کھیل سے محظوظ ہو رہے تھے کہ اچانک ہماری یونیورسٹی میں فزکس کے اُستاد احمد یار خان (بعد میں ڈاکٹر احمد یار خان اور وائس چانسلر گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان) اپنی سائیکل پر سوار اُدھر سے گزر رہے تھے۔ ہم نے حقِ شاگردی ادا کرتے ہوئے آداب عرض کی تو وہ سائیکل سے اُتر کر ہم سے ہمکلام ہوئے۔ پوچھا فزکس کی کس شاخ میں دلچسپی رکھتے ہو؟۔ ہم نے عرض کیا، نیوکلیئر فزکس کچھ زیادہ پسند ہے۔ فرمانے لگے "یہ تو ٹھیک ہے لیکن اُس میدان میں فی الحال ملک میں سکوپ کچھ کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اچھے نمبر لئے تو ملک کے واحد ایٹمی توانائی کے مرکز میں ریسرچ پر لگ جاوٗ گے۔ نہ تو پاکستان نے ایٹم بم بنانا ہے اور نہ ہی تمہاری ریسرچ ختم ہوگی"۔ یہ منظر اور ایسا مستقبل ہمیں بالکل نہ بھایا اور دوسرے ہی دن پرنسپل صاحب کو آنرز کی کلاسز چھوڑنے کی درخواست دے بیٹھے۔ یہ دیکھ کر ہمیں یقیناً بڑا افسوس ہوا کہ عین ہماری ریٹائرمنٹ کے قریب پاکستان ایک ایٹمی طاقت بن گیا لیکن ہم ڈاکٹر قدیر خان یا ڈاکٹر ثمر مبارک بننے کا اعزاز حاصل نہ کر سکے۔

مولانا اشرف

محمد اشرف صاحب اسلامیہ کالج میں عربی کے اُستاد تھے۔ ہماری فارسی اختیاری کے اُستاد جب کبھی چُھٹی پر ہوتے تو اشرف صاحب ہماری کلاس بھی لے لیتے۔ اُن کی فصاحت و بلاغت کے تو ہم اُس دن معتقد ہوئے جب کالج کے ڈین صاحب ریٹائر ہوگئے اور ایک دن مولانا اشرف صاحب کی مُبلّغانہ تقریر ہم نے سُنی۔ وہ بلاشبہ ایک عظیم انسان اور جیّد عالم تھے۔ ہمارے دوست ظفر بیگ بھیٹنی کی تجویز پر ہم چند دوستوں نے

مولانا صاحب سے قُرآنِ پاک کا درس لینے کا فیصلہ کیا۔جس کیلئے اُنہوں نے حامی بھرلی۔ظفر بیگ نے جو ایک ذہین وفطین مگر متلاطم شخصیت کا مالک تھا،خود تو محض چند دن تک ہمارا ساتھ دیا لیکن میں اور فتح محمد کافی عرصہ تک مولانا صاحب کے حلقہء درس اور صحبتِ صالحہ سے فیض یاب ہوتے رہے۔اُن ہی کے دولت کدّہ پر ہمیں کئی اکابرین سے ملنے اور اُن کی عالمانہ گُفتگو سُننے کا اتفاق ہوا۔ان ہی میں مشہور صاحبِ تصنیف وتالیف مولانا امین احسن اصلاحی اور تبلیغی جماعت کے حاجی عبدالحمید خان (ڈائریکٹر جنرل ٹیلیفون وٹیلیگراف)اور حاجی ارشد صاحب شامل تھے۔یہ عقدہ تو کافی دیر بعد ہم پر کُھلا کہ مولانا اشرف صاحب تو تحریکِ پاکستان سے بطور سالار مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور مولانا الیاس صاحب کی تبلیغی جماعت سے بحثیت ایک عظیم مبلغ کے وابستہ رہے۔اُن ہی دنوں ہندوستان سے مولانا الیاسؒ کے بیٹے اور جانشین مولانا محمد یوسف صاحب پاکستان آئے۔اُن سے ملنے اور اُن کے مواعظِ حَسنہ پشاور کی تاریخی مسجد مہابت خان میں سننے کا موقع ملا اور بعدازاں مولانا اشرف کی قیادت میں رائے وِنڈ میں بین الاقوامی تبلیغی اجتماع میں شریک ہوئے۔مولانا صاحب عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ صوفی و پیر بھی تھے اور صوفیاء کے چاروں مشہور سلسلوں سے بیعت تھے۔اُن کے اِن متنوع حیثیتوں کے متعلق بھی اُن سے دلچسپ بحث ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے ہماری معلومات میں اضافہ فرماتے۔اُن کا دولت کدہ مرجعِ خلائق تھا لیکن ہمارے درس کے اوقات بالکل جُدا تھے۔بعدازاں حج پر جانے اور پھر طویل علالت کی وجہ سے ہم مزید اُن کی صحبت سے مُستفید نہ ہوسکے۔

ہمارے ریاضی کے اُستاد افتخارالدین خٹک،مولانا صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے۔لیکن دونوں کے مشاغل اور دلچسپیوں میں بُعد المشرقین تھا۔اِفتخار صاحب اچھے ریاضی دان ہونے کے علاوہ ادب،شعروشاعری اور فنونِ موسیقی سے بھی شغف رکھتے تھے۔لیکن دونوں پڑوسیوں کا ایک دوسرے کیلئے باہم احترام کا رشتہ ضربُ المثال تھا۔

اُس سال خیبر یونین کے صدر کے طور پر محمد ہاشم بابر کا انتخاب ہوا۔ساتھ ہی اقبال حُسین خٹک نائب صدر منتخب ہوئے۔ہاشم بابر ایک منجھے ہوئے مقرر تھے لیکن اُن کے انتخاب اور کامیابی میں اُنکے دوستوں عبداللہ اور محمود الحق حقانی کا خاصہ حصہ تھا۔ہاشم بابر اُسوقت کے گورنر مشرقی پاکستان جنرل اعظم خان کے چھوٹے بھائی تھے۔ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے پشتو ادب میں خاصا نام پیدا کیا اور آدم جی پرائز سے سرفراز ہوئے۔عبداللہ صاحب کالج اور یونیورسٹی کے بہترین مقرر اور تسلیم شُدہ سکالر کے طور پر یاد رکھے جائیں گے۔وہ بیوروکریسی

کے اعلیٰ ترین عُہدوں پر فائز رہے۔ اُنکے علمی اور اخلاقی رُتبے پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ حقانی صاحب اکوڑہ خٹک کے ایک انتہائی معروف مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں لیکن کالج میں وہ اپنی لامحدود بذلہ سنجی اور یار باشی کی وجہ سے انتہائی معروف ومقبول شخصیت رہے۔

بیرونِ کالج بین الکلیاتی مباحثے

راقم الحروف نے اُس سال کے دوران خیبر یونین کے جلسوں میں بھرپور شرکت کی اور مختلف دیگر کالجوں کے کُل پاکستان **بین الکلیاتی مباحثوں** میں بھی اسلامیہ کالج کی نمائندگی کی۔ گورنمنٹ کالج بنوں، محمد اکبر خان کالج مردان، ایڈورڈ کالج پشاور، خیبر میڈیکل کالج پشاور، گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد، گارڈن کالج راولپنڈی، جہانزیب کالج سیدوشریف وغیرہ سب ہی جگہ انگریزی یا اُردو کسی نہ کسی مباحثہ میں حصہ لیا۔ جہانزیب کالج سیدوشریف گئے تو اقبال حُسین خٹک میرے ہمراہ تھے۔ اپنی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر والیءِ سوات کے محل سرا میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ والی صاحب کے چھوٹے بیٹے اقبال حُسین کے برن ہال سکول ایبٹ آباد کے ہم جماعت تھے۔ اُن سے وقت لیکر سیدو کالج یونین کے نائب صدر کے ہمراہ دربارِ عالیہ میں حاضر ہوئے جہاں کا نظم وضبط مثالی تھا ہی۔ میاں گُل محمد میرزیب اپنے مخصوص کمرے میں تشریف فرما تھے۔ خُدام کی اچھی خاصی تعداد پہرے داروں کی طرح صف بستہ ودَست بَستہ اُن کے کسی بھی اشارے پر عمل پیرا ہونے کیلئے چوکس کھڑی تھی۔ اُن کی نشست کے سامنے مہمان کیلئے صرف ایک کُرسی موجود تھی۔ اشارہ ہوا تو دوعدد اور کُرسیاں رکھ دی گئیں۔

بدلتا ہے آسمان رنگ کیسے کیسے

ہماری چائے، کافی سے تواضع کی گئی۔ میاں گُل نے سگریٹ منگائے جو ایک نقرئی طشت میں پیش کئے گئے۔ اقبال حُسین نے ساتھ دیا میں تو آج بھی نہیں پیتا۔ لیکن ہمارے سواتی مہمان تو "چین سموکر" تھے لیکن اُنہوں نے بھی معذرت کی۔ اُن دنوں والی صاحب کے بڑے بیٹے صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی دامادی میں آچکے تھے۔ اگلی حکومت آئی تو جنرل یحیٰی خان نے تمام ریاستوں کو پاکستان میں مدغم کردیا۔ والیانِ ریاست وظیفہ خوار ہوگئے۔ اُن کی جگہ کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں نے لے لی۔ 30 سال بعد مجھے اپنے پاکستان ایڈمنسٹریٹو کالج کے ساتھیوں کے ہمراہ سوات جانے کا اتفاق ہوا۔ پاکستانی ڈپٹی کمشنر سے ضلع سوات کے امور پر بریفنگ لینے اُنکے دفتر

حاضر ہوئے۔تھوڑی دیر میں ایک اہلکار ایک پرچی لے کر حاضر ہوا۔ڈپٹی کمشنر صاحب نے ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد حُکم دیا! بٹھادو۔تھوڑی دیر انتظار بھی کرنے دو۔اور پھر کچھ وقفے بعد ان آنکھوں نے ایک اَدھیڑ عُمر شخص کو اندر آتے اور آداب بجالاتے ہوئے دیکھا۔پوچھنے پر معلوم ہوا یہ صاحب والی صاحب کے چھوٹے فرزند اَرجُمند ہیں جنہیں ہم نے سالوں پہلے بڑے کروفر کے ساتھ والی کے محل کے ایک عالیشان اور پُرشکوہ کمرے میں چوبداروں کے جُھرمٹ میں دیکھا تھا، جہاں کسی چڑیا کو بھی پر مارنے کی جُرات نہ تھی۔آج وہ سب کچھ ایک خواب بن چُکا تھا۔

ایک بھونڈی شرارت

اچھا کام کوئی بھی کرے خُدا اور مخلوقِ خُدا دونوں کی نظر میں وہ مخدوم ہو جاتا ہے۔جنرل اعظم خان مشرقی پاکستان کے ایک انتہائی ہردلعزیز حکمران ثابت ہوئے۔اُنکی شب وروز محنت اور ترقیاتی کاموں میں ایک مزدور بن کر عوام کے ساتھ مِل جُل کر اُنہیں پایہ تکمیل تک پہنچانے کے عزم راسخ نے جنرل صاحب کو یہ مقام دلایا۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اُسوقت ہوا جب ایک روز ظفر بیگ مجھے کسی بہانے اپنے ہاسٹل لے گیا۔وہ اُسوقت انجینیئرنگ کالج میں سالِ اوّل کا طالب علم تھا۔ایک کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے ایک مِنٹ کی اِجازت لی ،اندر گیا اور پھر لوٹ کر میرے پاؤں پکڑ لئے ، کہنے لگا! اس کمرے میں میرے تین بنگالی دوست ہیں۔وہ عرصے سے میری خوشامد کر رہے ہیں کہ اُنہیں جنرل اعظم کے بھائی کی ایک جھلک دکھائی جائے۔اور میں اُنہیں بتا تا رہا ہوں کہ ہاشم بابر میرا دوست ہے اور میں اُنہیں تُمہارے پاس ضرور لاؤں گا۔حالانکہ ظفر بیگ نے شاید اُس وقت تک اُسے دیکھا تک نہیں تھا۔کہنے لگا'' آج تو میں نے اُن سے اُسے اُنکے پاس لانے کا پکّا وعدہ کرلیا تھا۔تم صرف خاموش رہو،اندر آؤ اور میری لاج رکھو۔''ابھی میں اس اچانک صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ تینوں مدّاح باہر نکل آئے اور مجھے سر آنکھوں پر بٹھانے لگے۔بڑے پریشان کُن لمحات تھے۔''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' والا معاملہ تھا۔کبھی میں ظفر بیگ کی مُلتجی نِگاہوں کو دیکھتا اور کبھی اُن بھولے بھالے بنگالی نوجوانوں کو۔خیریت اب چُپ رہنے میں تھی۔ظفر بیگ سے تو بعد میں نپٹنا تھا۔اندر گئے تو اُن بیچاروں نے انواع واقسام کے لوازمات سے میزوں کو سجایا ہوا تھا۔ظفر بیگ ایک فاتحانہ انداز میں ڈینگیں مار رہا تھا اور میزبان بھی خوشی سے پھولے نہ سمارہے تھے۔صرف میری حالت دیدنی تھی۔ایک آدھ چائے کا گھونٹ حلق سے اُتارا، چند رَسمی کلمے بولے اور جلدی سے کسی مصروفیت کا بہانہ کر کے پھر کبھی ملنے کا کہہ کر ظفر بیگ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر نکالا اور لاحول پڑھتے ہوئے اپنی راہ لی۔

سِول ڈیفنس کیمپ

گرمیوں کی چھٹیوں میں ڈگری کلاسز کے سب طلباء و طالبات کو ایک مُعینہ میعاد تک عوامی خدمات (سوشل ورک) انجام دینا پڑتی تھیں۔ ہم نے اس کے متبادل کے طور پر مری اور گلیات کے سرد پہاڑوں کے دامن میں واقع زیریں باڑیاں میں منعقدہ ڈیفینس کیمپ میں شرکت کی۔ یہ بھی زندگی کا ایک یادگار تجربہ ثابت ہوا۔ ملک بھر کے مختلف کالجوں سے کئی درجن ٹیموں نے اس نیم فوجی تربیت میں بڑی دِلجمعی کیساتھ حصہ لیا۔ یہاں پر باقاعدہ ماہرین کی نگرانی میں ہم سب کو فوجی ڈرِل اور دوسرے فنونِ سپاہ گری سکھائے گئے۔ رائفل شوٹنگ، برین گن، اور اسٹین گن کا استعمال۔ ہتھیار استعمال کئے بغیر تہی دستوں کی دو بدو لڑائی (unarmed combat and close quarter battle)۔ دُشمن کی جُستجو کیلئے ''Reconaissance'' اور میپ ریڈنگ جیسے سب ہی گُروں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ہمارے ایک معمر اُستاد جو جنگ عظیم اوّل میں دادِ شجاعت ادا کر چُکے تھے، ہمیں اپنی بندوقوں کی صفائی کا خصوصی درس دیتے تھے۔ ہونہار شاگردوں نے تو اُن کا نام ہی ''اُستاد پُل تھرو'' رکھ دیا۔ کسی کی وردی دُرست طور پر اِستری نہ ہوتی تو ایڈجوٹنٹ صاحب اُس کی دُرگت بناتے ہوئے اُسے طعنہ دیتے کہ وردی کس مٹکے سے نکال کر لائے ہو۔؟ منچلوں نے اُن کا نام ''مٹکا صاحب'' رکھ دیا بہر حال یہ چُٹکلے تو مورال اونچا رکھنے کیلئے چلتے رہتے تھے لیکن سارا دن رگڑیں کھانے کے بعد بھوک خوب لگتی تھی اور نیند کا تو کیا کہنا۔ ہمارے ساتھی سعید خان اور ایوب خان تو یوں لگتا تھا گویا ساری عمر فوجی تربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ تقریباً ایسا ہی حال آخر میں سب دوستوں کا بن چُکا تھا۔ تب ہی تو اسلامیہ کالج پشاور کو بحیثیتِ مجموعی بہترین کارکردگی کی ٹرافی سے نوازا گیا۔

خیبر یونین

کالج میں طلباء کی قائدانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے اور اُنہیں نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جُستجو بنانے کیلئے ایک مجلسِ طُلباء بنام خیبر سٹوڈنٹس یونین موجود تھی۔ اس مجلس کے عمومی اجلاس خیبر یونین ہال کی پُر شکوہ عمارت میں منعقد ہوتے تھے۔ یہ ہال اپنی تمام تر جلوہ گری کے ساتھ 1942ء سے موجود تھا جب اس کی تقریبِ رونمائی کیلئے نواب بھوپال جناب عزت مآب حمید اللہ خان خصوصی طور پر اسلامیہ کالج پشاور تشریف لائے تھے۔ اس

ہال نے دُنیائے اسلام اور برصغیر پاک و ہند کے نامور راہنماؤں اور سحر انگیز اور شعلہ بیان مقررین کیلئے ایک بہترین پلیٹ فارم مہیا کیا۔ان راہنماؤں میں مُفتی اعظمِ فلسطین امین الحُسینی ،نواب بہادر یار جنگ ،کرم چند گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، قائدِاعظم محمد علی جناح ،مولانا ابوالکلام آزاد، تُرکی کی خالدہ ادیب خانم ،شہنشاہِ ایران محمد رضا پہلوی ،صدر تُرکی جلال بایار اور جانے کتنے دوسرے مشاہیرِ عالم شامل تھے۔اِن میں سے کچھ تو خیبر یونین کے اعزازی لائف ممبر بھی بنے۔اس تاریخی مجلسِ طلباء کی قیادت کیلئے ہر سال ستمبر ،اکتوبر میں انتخابات منعقد کئے جاتے تھے جو امیدواران کی تقریری مہارت اور تعلقاتِ عامہ پر عبور کا ایک کڑا امتحان ہوا کرتا تھا۔ساتھ ہی سب طلباء کیلئے جمہوری اقدار کی پاسداری کا درس بھی۔منتخب صدرِ مجلس اور اُنکی منتخب اراکینِ کابینہ،خیبر یونین کی آئین کی رو سے متعینہ حدود کے اندر رہتے ہوئے وسیع اختیارات کے حامل ہوا کرتے تھے۔جس تزک و احتشام سے وہ کسی اجلاس کے موقع پر ہال میں داخل ہوتے تھے وہ منظر قابل دید ہوا کرتا تھا۔ایک بڑا بجٹ اُنکی عملداری میں ہوتا تھا۔جس کو وہ یونین اور طلباء کے مفاد میں متعدد مدّ وں میں استعمال کیا کرتے تھے۔اس میں طلباء کے لئے وظائف اور درسی کُتب کی فراہمی، تعلیمی دورے،مشاہیرِ وطن اور ماہرینِ فن کو مدعو کرنے کیلئے انتظامی اخراجات سب ہی شامل تھے۔صدرِ مجلس کا ''پریزیڈنٹ لاج'' عثمانیہ ہاسٹل کے صدر دروازے کے اوپر واقع تھا، جو صدر صاحب کیلئے مخصوص ایک مختصر سے کمرے اور ایک کمیٹی روم پر مشتمل تھا۔جسکی بالکونی کے اوپر یونین کا پرچم اُسوقت اپنی ایک شان سے لہرا رہا ہوتا تھا جب صدرِ یونین بنفسِ نفیس وہاں موجود ہوتے تھے۔ستمبر 1962 میں جب گرمیوں کی تعطیلات کے بعد کالج کی پڑھائی شروع ہوئی تو دوستوں نے اصرار کیا کہ میں یونین کی صدارت کیلئے الیکشن لڑوں۔لیکن میں نے اپنی تعلیمی ذمہ داریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف نائب صدر کا انتخاب لڑنے پر اکتفا کیا۔بفضلِ خُدا میں یہ مقابلہ آسانی سے جیت گیا۔یا یوں سمجھئے کہ طالبِ علم ساتھیوں نے میری یونین کیلئے خدمات کی قدر افزائی فرمائی ورنہ میرے دونوں مدِ مقابل صوابی کے امان اللہ خان اور مانسہرہ کے شمس الرحمٰن خاصے مضبوط اُمیدوار تھے۔ اقبال حُسین خٹک صاحب صدر منتخب ہوئے۔حلفِ وفاداری کی تقریب میں محمد علی مرحوم وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی مہمانِ خصوصی تھے۔

مادرِ ملت کی آمد

چند ہی روز گزرے تھے کہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح پشاور تشریف لائیں۔اُنکے عظیم بھائی قائدِاعظم

محمد علی جناح کی سِیل کردہ وصیت نامے کے تیس سال پورے ہو چکے تھے۔ وصیت نامہ کھولا گیا تو معلوم ہوا کہ اُنہوں نے اسلامیہ کالج پشاور سے اپنی لازوال محبت کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے ایک خطیر رقم صوبہ سرحد کے اِس مایہ ناز مادرِعلمی کے نام کر دی تھی۔ اَساتذہ اور طلباء کے ایک وفد نے اُن سے ڈینز ہوٹل میں ملاقات کی اور اُنہیں باضابطہ طور پر اسلامیہ کالج مدعو کیا۔ جہاں خیبر یونین کی ایک خصوصی تقریب میں یونین کا اعزازی لائف ممبر بنایا گیا۔ اس موقع پر اُنہوں نے اپنے عظیم بھائی کے دستخط دیکھنے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ میں نے ہی خصوصی سُنہری کتاب میں وہ دستخط اُنہیں دکھلائے۔ جو قائداعظمؒ نے 1936 میں خیبر یونین کا لائف ممبر بننے کے بعد اس کِتاب پر ثبت کر دئے تھے۔ لیکن قائداعظمؒ کی رُوح برزبانِ حال یہ کہہ رہی تھی کہ!

ثبت است برجریدہ ءِ عالم دوامِ ما۔

مسٹر ایچ ایم کلوز ہال کی راہداری میں بے چینی سے ٹہلتے نظر آئے اور میرے قریب آ کر چپکے سے پوچھنے لگے۔ ''محترمہ'' کا کیا مطلب ہے؟ میں نے اُنہیں اپنی سمجھ کے مطابق ترجمہ کر کے دیا تب ہی انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ محترمہ کے ساتھ یونین کی کابینہ کا ایک یادگاری فوٹو گراف بنوایا گیا۔ اور پھر یہ تاریخی تقریب انجام کو پہنچی۔

یونین کا بجٹ اجلاس منعقد ہوا تو صدر صاحب سے بھرپور مقابلہ کر کے ہار جانے والے حزبِ اختلاف کے دونوں قائدین محمد ہاشم بابر (سابق صدر) اور عبدالصمد آفریدی (سابق سیکرٹری جنرل) اپنے اپنے حامیوں کے ہمراہ بھرپور مخالفت پر تُلے نظر آئے۔ سوالات اور پوائنٹس آف آرڈرز کی بوچھاڑ کرنے کے بعد حزبِ اختلاف اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے ہال سے واک آوٹ کر گئی اور صدر صاحب نے اپنے حمایتیوں کی مدد سے سالانہ بجٹ منظور فرما دیا۔ کچھ ایسا ہی سلسلہ ہر سال دیکھنے میں آتا تھا۔ حزبِ اختلاف اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی، اور صدرِ مجلس کیطرف سے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا بھرپور اِظہار ہوتا تھا اور یوں جمہوری طور طریقے طالب علم برداری میں مرّوج کرنیکی پوری کوشش کی جاتی تھی۔

یونین کے صدارت۔ اہم مُباحثے اور تقریبات

صدارت اقبال حُسین کو راس نہ آئی کیونکہ اب وہ کالج کے طالب علم ہی نہ تھے۔ دراصل وہ ڈگری پاس کورس کے سالِ سوئم میں تھے اور جب اِس کورس کا دورانیہ دوسال قرار دے دیا گیا تو اُن کی خیبر یونین کی رُکنیت ازخود ہی ختم ہو گئی۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل اور خیبر یونین کے سرپرست پروفیسر اشرف دُرانی صاحب نے

یونین کے آئین کے مطابق نائب صدر کے بطورِ صدر ترقی کا اعلانیہ جاری کردیا اور یوں میں خیبر یونین جس کے قیام کو چالیس برس ہو چُکے تھے، اُسکا چالیسواں صدر بن بیٹھا۔ یہ نامزدگی نہ صرف آئین کے مطابق تھی بلکہ طلباء کے سارے دھڑوں کو بھی قابلِ قبول تھی اور ساتھ ہی منتخب کابینہ بھی برقرار رہی۔ میرے یہ ساتھی عبدالرسول امین (سیکرٹری جنرل)، محمد شیراز (لائبریرین) ارسلان خان، صدرِ اعظم، روح اللہ جان، ہدایت اللہ اور محمد وقار آفریدی، بالترتیب سالِ پنجم، چہارم، سوئم، دوئم اور اول کے نمائندے اور پروفیسر ضیاءالدین خزانچی تھے۔ سب دوستوں نے ایک متحدہ ٹیم کے طور پر ہر معاملے میں میرا ہاتھ بٹایا اور بفضلِ تعالیٰ ہر قدم پر ہم نے کالج اور مجلسِ طلباء کا نام روشن کیا۔ عبدالرسول امین اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے آبائی ملک افغانستان چلے گئے۔ وہاں وہ کابل یونیورسٹی میں لِسانیات کے پروفیسر رہے۔ سوویٹ قبضے کے دوران پابندِ سلاسِل رہے۔ دوبارہ پاکستان ہجرت پر مجبور ہوئے۔ آزادی کیلئے بھرپور قلمی جہاد کیا۔ بے شمار کتابوں کے مصنف بنے۔ انگریزی، اُردو، فارسی اور پشتو سب زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ بین الاقوامی ہیومن رائٹس کمیشن کے ممبر رہے اور افغان صدر کرزئی کی پہلی کابینہ میں وزیر رہے۔ اگرچہ اُن کا سارا خاندان آسٹریلیا ہجرت کرنے پر مجبور ہوا لیکن اُنکی صحافتی اور ادبی کاروائیاں جاری رہیں۔ ہمارے سابق صدر اقبال حُسین خٹک بھی کاروباری دُنیا سے میدانِ سیاست میں گئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے ضلع پشاور کے صدر اور پھر کافی عرصہ تک صوبائی وزیرِ ماحولیات رہے۔ یہی حال دوسرے ساتھیوں کا ہے جنہوں نے زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنا لوہا منوایا۔

میرے دورِ صدارت کا مشن اور محور طلباء برادری کے درمیان اتحاد و یگانگت، مثبت تعلیمی و غیر تعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی، طلباء کی ملّی اور روحانی جذبوں کو جِلا دے کر مستقبل کی ذمہ داریوں کیلئے تیار کرنا ٹھہرا۔ بلا شبہ یہ چیزیں جدوجہدِ مسلسل کی متقاضی ہیں لیکن ہم نے اپنے طور پر بھرپور کوشش ضرور کی اور اپنے وقت تک کم از کم اس میں کامیاب بھی رہے۔ اسکی ایک جھلک آنے والی سطروں میں انشاءاللہ ضرور ملیگی۔

خیبر یونین کے بنیادی مقصد فنِ خطابت کے فروغ کیلئے حسبِ معمول مختلف قسم کے تقریری مقابلے جن میں مباحثے (ڈیبیٹس) اور موضوعاتی مقابلے (ڈیکلیمیشن کانٹیسٹ) دونوں شامل تھے، تینوں مرّوجہ زبانوں انگریزی، اُردو اور پشتو میں کرائے گئے۔ کالج یونین کے سابق صدور اور پرانے مقرّرین کے درمیان بھی مقابلہ ہوا تاکہ نئی نسل دورِ گذشتہ کے نامور فصیح البیان بزرگوں سے کچھ سیکھ سکے۔ یہ مباحثے اس لحاظ سے

بڑے جاندار رہے کہ مولانا عبدالقادر، مسعود کوثر، کریم اللہ دُرانی اور متعدد دوسرے زُعماء جو ایک وقت میں یونین کے سٹیج پر اپنی فصاحت و بلاغت کا جادو جگاتے رہے، آج وہ نئے دور کے اُبھرتے ہوئے جوانوں کے مدِ مقابل کھڑے تھے۔ مولانا قادر نہ صرف خیبر یونین کے صدر رہ چُکے تھے، بلکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے یونین کے سابق صدر بھی تھے اور اُن دِنوں پشتو اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔ مسعود کوثر خیبر یونین کے سابق صدر تھے اور بعد میں صوبہ سرحد اسمبلی کے سپیکر بنے اور کچھ عرصہ پاکستان کی سینٹ کے ممبر رہے۔ جناب کریم اللہ دُرانی مشہور وکیل اور اعلیٰ درجے کے مقرر تھے اور بعد میں ہائی کورٹ کے جسٹس رہے۔

ان سب مباحثوں اور مناظروں کے مصنفین حضرات اکثر کالج یا یونیورسٹی کے نامور ماہرینِ ادب و لِسانیات ہوتے تھے، جنکا ملکی سطح پر ایک مقام تھا۔ پروفیسر طاہر فاروقی، افضل حُسین اظہر، مُحسن احسان، خاطر غزنوی، احمد فراز، محمود احمد شمسی، (ڈاکٹر) اورنگزیب شاہ، ڈاکٹر غلام اکبر نقوی، پروفیسر جلال الدین خلجی، محمد اعظم خان اعظم، مولانا عبدالقادر اور دیگر اہلِ قلم خواتین و حضرات اس سلسلے میں مکمل تعاون اور سرپرستی فرماتے رہے۔

سالانہ کُل پاکستان بین الکلیاتی مباحثوں کی تیاری بڑے اہتمام سے کی گئی۔ تحریری دعوت ناموں کے علاوہ، کالج کے سرکردہ طلباء کی مختلف ٹیمیں بھی بنا کر تمام اہم کالجوں میں بھجوائی گئیں تا کہ ملک بھر کے چیدہ چیدہ طلباء مقررین یونین کے اسٹیج پر مقابلوں میں حصہ لیکر اسلامیہ کالج کے طلباء کیلئے مثالی کارکردگی کا مظاہرہ کرسکیں۔ دراصل یہ سٹیج ہی ہر دور میں ایک مثالی اکھاڑہ رہا ہے اور اچھے مقرّرین اس سٹیج پر ایک دوسرے کو مقابلہ کرنے کا چیلنج دیتے رہے ہیں۔ اُس سال بھی تمام اہم کالجز کی ٹیمیں اپنی اپنی یونین کے صدور کی سرکردگی میں آل پاکستان ڈیبیٹس میں شریک ہوئیں۔ صوبہ سرحد کے تقریباً سب ہی کالجوں کی ٹیمیں موجود تھیں، ہی اِن کے علاوہ گورنمٹ کالج لاہور کی ٹیم اُسوقت کے صدر یونین ارشاد اللہ خان، ہارون کیانی، مس عذرا حمید اور مس پروین قادر پر مشتمل تھی۔ اور لاء کالج لاہور کی ٹیم نذیر اختر، اختر محمود اور وسیم سجاد (جو بعد میں ملک کے نامور قانون دان، وفاقی وزیر اور چئیرمین سینٹ اور صدرِ پاکستان بھی رہے۔) گورنمنٹ کالج راولپنڈی کی ٹیم اپنے کالج کے صدر منتظر نقوی اور رفیق چوہان۔ انجینئرنگ کالج لاہور کی ٹیم میں خالد نظامی، اختر رضوی اور اسماعیل ظفر، میرپور (آزاد کشمیر) سے جاوید نظامی، طاہر محمود اور ممتاز حُسین، اسلامیہ کالج لاہور سے ساجد رشید، اشفاق سعید اور بے شمار دیگر مقررین نے اپنی بہترین قابلیتوں کا اظہار کیا اور سامعین سے بھرپور داد وصول کی۔ اُس وقت کے ڈپٹی کمشنر پشاور جناب مسعود

نبی نور، جو بعد میں بہت سے اعلیٰ ملکی عہدوں پر فائز رہے اور آر۔سی۔ڈی (پاکستان، ایران، اور ترُکی کی ریجنل یونین) کے سیکرٹری جنرل بھی رہے، خود اچھے مقرر ہونیکی وجہ سے ان مباحثوں میں بڑی دلچسپی لیتے رہے۔ تین چار روز کی لگاتار مشقت کے بعد ہم سب مہمانوں کو ریاست سوات کے دلفریب نظاروں کی جھلک دکھانے کیلئے ایک تفریحی دورے پر لے گئے۔ جہاں پر والی سوات میجر جنرل میاں گل جہانزیب سے، جو بذات خود اسلامیہ کالج کے ایک سابق طالب علم تھے، اُن سب کی ملاقات کرائی گئی۔

سوات کے اس تفریحی دورے کے اخراجات پورے کرنے کیلئے ایک دلچسپ انتظام کیا گیا۔ وہ ایسے کہ اُن دنوں پاکستان میں انڈین فلموں کی نمائش پر پابندی تھی اور صرف خصوصی اجازت سے پُرانی فلمیں، جو کسی زمانے میں پاکستان درآمد ہو چکی تھیں، دکھلائی جا سکتی تھیں۔ اس کی اجازت ڈپٹی کمشنر سے لے لی گئی اور جونہی یہ بات مشہور ہوئی، بُکنگ شروع ہو گئی۔ اگرچہ ٹکٹ کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی، لیکن مسئلے کی نوعیت کا اندازہ تو اُس وقت ہوا جب خیبر یونین ہال میں جگہ کم پڑ گئی اور اوپر سے مشین نے آواز دینی بند کر دی لیکن طلباء جن میں اسلامیہ کالج، اسلامیہ کالجیٹ سکول اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات سب شامل تھے، ان مشکلات کا سامنا کرنے والے کہاں تھے۔ بہرحال خُدا خُدا کر کے وہ بلیک اینڈ وائٹ فلم ''پرچھائیاں'' واقعی اصل کا پرتو ثابت ہوئی، لیکن ہمارے سوات آنے اور جانے کے اخراجات بطریق احسن پورے ہو گئے۔

پشاور کے کئی دیگر ادارے بھی اپنے ہاں آل پاکستان مباحثے کراتے تھے۔ اُن سب کی مجالسِ طلباء کی درخواست پر ایڈورڈ کالج، گورنمنٹ کالج، زرعی کالج اور پشاور یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی اور جدید یورپی زبانیں اور میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں کے صدر حضرات کی ایک خصوصی میٹنگ ہم نے اپنے پریزیڈنٹ لاج میں منعقد کرائی تا کہ تمام مباحثے ایک متفقہ لائحہ عمل کے تحت کروائے جائیں۔ باہر سے آنے والے مقررین کی رہائش کیلئے ہم نے خیبر یونین کی سہولیات پیش کیں تا کہ طلباء برادری کے درمیان جذبِ باہم قائم و دائم رہے۔ اس پیشکش کو سب ہی نے سراہا۔

اُس سال خیبر یونین نے مشرقی پاکستان کے چیدہ چیدہ طلباء کے ایک وفد کی میزبانی بھی کی تا کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں اخوت کا جذبہ نوجوان نسل پوری طرح محسوس کر لے۔ اسی طرح جب برادر مُلک ایران سے تیس عدد اساتذہ اور طلباء پر مشتمل ایک وفد نے پاکستان کا دورہ کیا تو بھی خیبر یونین نے اُنکی آؤ بھگت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہمارے جنرل سیکرٹری عبدالرسول امین اور دوسرے فارسی جاننے والے طلباء نے

اُن پر اپنی فارسی دانی کی بھرپور مشق کی۔ اُستادِ محترم ڈاکٹر غلام اکبر شاہ نقوی تو فخریہ فرماتے رہے کہ اُنہوں نے اپنی ڈاکٹریٹ اُسی ملک سے کی ہے جہاں کی قومی زبان فارسی ہے۔ میں نے اسلامیہ کالج کے طلباء کی طرف سے وفد کو علامہ اقبالؒ کے فارسی کلام کا ایک مکمل سیٹ پیش کیا۔

کالج کی گولڈن جوبلی مَنانے کی تیاریاں

یہ وہ سال تھا جب اسلامیہ کالج اپنے قیام کا جشنِ زریں منا رہا تھا۔اس سلسلے میں کالج کی قائم کردہ تیاری کمیٹی کے اجلاس میری صدارت میں منعقد ہوتے رہے۔ان ہی جلسوں میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اسلامیہ کالج چونکہ صوبہ سرحد کے سب ہی عوام کی اُمنگوں کا امین ہے،اسلئے تیاریوں کے سلسلے میں مختلف طبقوں کے نمائندہ حضرات کو شامل حال کیا جائے۔لہذا یوم بانیانِ کالج کی تقریب میں ہر مکتبِ فکر کے نمائندوں کو دعوت دی گئی۔ان میں سیاسی ، مذہبی اور سماجی مختلف نظریات رکھنے والے سب ہی شامل تھے۔دورانِ اجلاس ایک دلچسپ صورتِ حال اُسوقت بنی جب میں نے وائس چانسلر چوہدری محمد علی صاحب کی تجویز پر سُرخ پوش رہنما جناب عبدالغفار خان صاحب کے صاحبزادے ولی خان صاحب کو سٹیج پر آ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی دعوت دی جو اُنہوں نے قبول فرمالی۔تھوڑی ہی دیر میں مجھے بتایا گیا کہ مقابل دھڑے کے مشہور سیاسی رہنما جناب محمد خان لوند خوڑ اپنا موٹا عصا لئے میری تلاش میں ہیں۔بدقسمتی سے جلسے کے اختتام کا اعلان ہو چکا تھا لہذا ہم لوند خوڑ صاحب کو بولنے کی دعوت نہ دے سکے۔یہ فروگزاشت محض اتفاقیہ تھی اور وائس چانسلر صاحب کی تجویز اتنی اچانک تھی کہ مسئلے کے سیاسی مضمرات پر سوچا ہی نہ جا سکا۔معاملہ یہیں تک رہتا تو خیر تھی لیکن جب تھوڑی دیر بعد مہمانانِ گرامی کے ساتھ ایک گروپ فوٹو کھچوایا جانے لگا تو ہم سب طلباء پیچھے کھڑے ہو گئے اور محض چند کُرسیاں بزرگ ترین مہمانوں کیلئے رکھ دی گئیں۔اچانک ولی خان صاحب نے میرا ہاتھ کھینچا اور مجھے اپنے ساتھ اپنی کرسی پر بٹھا دیا۔میں اُنکی بزرگانہ شفقت سے انکار بھی نہ کر سکا۔یہ اُنکی غالباً قیامِ پاکستان کے بعد سے اُسوقت تک کسی بھی طلباء یونین کے اجلاس میں شرکت کا پہلا موقع تھا۔ورنہ ابتک اُنکی جماعت مسلسل زیرِ عتاب تھی۔اگرچہ ہماری طرف سے ہر طرح کی سیاسی جانبداری سے اجتناب برتنے کی کوشش ہو رہی تھی۔لیکن سیاستدانوں کا کیا کہنا! ولی خانصاحب اپنے ساتھ بٹھانے پر بضد تھے اور لوند خوڑ صاحب مجھے گھور گھور کر دیکھے جا رہے تھے۔لیکن وہ عمر کسی طرح کی ٹینشن لینے کی کہاں تھی،اور ہم نے سب حضرات کو بڑی چاہت اور احترام سے خُدا حافظ کہا۔